انوار حکمت

۱۳۷۲ھ
انوارِ حکمت
ضرت سید الشہداء کے دس حکیمانہ اقوال)
از
شہید حسن صاحب شہید صفی پوری
کامل لکھنؤ یونیورسٹی

تعارف

مقتل الحسن، مقتل الحسین
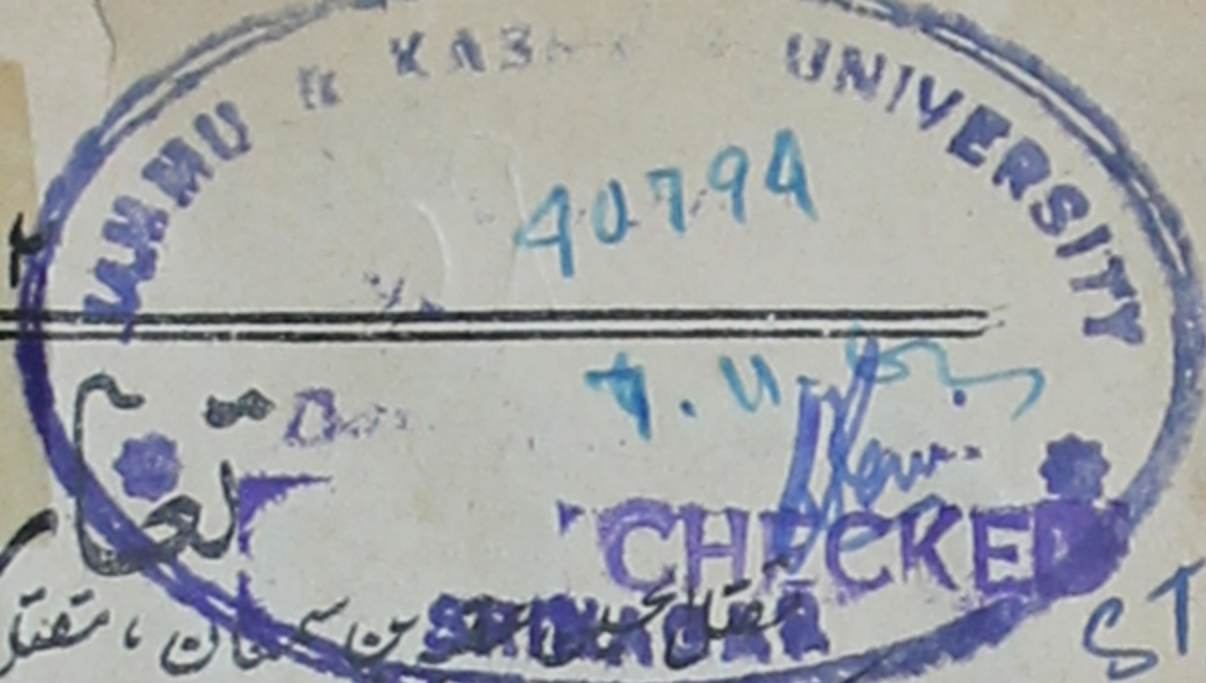
وغیرہ کی اشاعت سے اہل علم میں نمایاں بیداری کے ا
تعطل کے باوجود بیرون ملک اور ملک کے ہر حصہ سے تحقیق و نظر
کیا۔ ان کتابوں سے ادیبوں اور شاعروں کو ذہنی مآخذ مل گئے
مل گئے۔ مصر و عراق و ایران کے علماء اور یوروپ کے بعض مستشر
کی اہمیت پر رسالوں اور اپنے خطوں میں کشادہ دلی کے ساتھ اظہار
و پاکستان میں بھی ان پر مناسب تبصرے اور مقالات شایع ہوئے۔ مولانا عبد الماجد
دریا آبادی، مولانا ضیا احمد بدایونی ایم اے لکچرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، باقر مہدی
ایم اے فیض آبادی، مولانا مرتضیٰ حسین صاحب صدر الافاضل لکھنوی ثم لاہوری
ڈاکٹر محمد وحید مرزا صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، سید آغا حیدر ایم اے
شعبۂ فارسی ناگپور یونیورسٹی۔ مولانا محمد رضی صاحب مرحوم زنگی پوری، شاعرہ ملت
اقبال بانو، ڈاکٹر ابو الحسن سید پوری، عاشق حسین ایم اے برہان پوری۔ خان بہادر
علی سجاد حسین ریٹائرڈ کمشنر وغیرہ نے اپنے قیمتی تبصرے شایع کیے۔ ملک میں
اور انشا پردازوں کی بے حد کمی ہو گئی ہے۔ ایک جماعت علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب
کاموں پوری مجتہد العصر کے زیر تربیت ہے۔ اگر اس کی مشق جاری رہی تو ان سے
ہے کہ یہ بدلے ہوئے ماحول میں علم و ادب کی خدمت کر سکے گی۔

مقتل الحسین یعقوبی میں امام حسین کے چند حکیمانہ اقوال ہیں۔ رسالہ
میں ادیب ملت سید شہید حسن صاحب شہید صفی پوری دبیر
نے انھی اقوال کی تشریح کی ہے۔ اس کے پہلے آپ کا ایک رسالہ
"مقتل عقبہ کی روشنی میں" شایع ہو چکا ہے۔ اللہ کرے زور
میں صمیم قلب سے ادارۂ مجلس علمی کی اصلاحی و علمی
یقین کامل ہے کہ اس کے رسائل سے قوم کا ذہنی معیار کافی بلند ہو
ادارہ کو علامہ کاموں پوری ایسے مدبر کی سرپرستی کا شرف حاصل
بے لوثی، خلوص اور روشن فکری میں اس وقت تنہا اپنی مثال ہیں۔

فدائے ملت (شیخ) ممتاز حسین جونپوری لکھنؤ

اعلان:۔ مجلس علمی باغ لکھنؤ سے ہر قسم کی کتابیں منگائیے۔ نسیم کاظم کاموں پوری۔

(۱) الصّدق عزّ "سچائی عزت ہے" حسین ابن علیؑ (مقتل یعقوبی)

حکیم روحانی حضرت امام حسینؑ کا یہ قول عزت کا اسلامی معیار پیش کرتا ہے۔ اس قول کے دو اجزا ہیں جن کے سمجھنے پر پورا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔

(۱) سچائی کی اہمیت کیا ہے۔

(۲) عزت کا معیار سچائی ہے۔

بظاہر سچ بولنا نہایت آسان بات ہے لیکن نفس انسانی کی گہرائیوں کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد جب غور کیا جاتا ہے کہ جھوٹ کن کن موقعوں پر بولا جاتا ہے اور جھوٹ بولنے کے محرک کون کون سے جذبات ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسانی جذبات و خواہشات جھوٹ بولنے کے محرک اور سچائی سے روکنے والے ہو سکتے ہیں۔

خداوند عالم نے انسان کو دو قوتیں قوت دافعہ اور قوت جاذبہ اس لیے عطا کی ہیں کہ عقل کی رہنمائی میں ہم مضرتوں سے بچ سکیں اور اللہ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں۔ بغیر جذبات اور عقل کے بقائے حیات ناممکن ہے لیکن چونکہ قوتوں کے عطا کرنے سے قدرت کا منشاء ہمارا تحفظ ہے لہٰذا اپنے نفس کا تحفظ کرنے والا مقاصد الٰہیہ کو پورا کرتا ہے۔ لیکن جب علم کی کمی کے باعث عقل، حق اور باطل، مضر اور مفید، سکون اور اضطراب، مصیبت اور راحت، مسرت اور غم میں تمیز نہیں کرنے پاتی اور غلط فیصلہ صادر کرتی ہے تو ہمارے اور ہماری عقل دونوں ہمارے لیے مہلک، ضرر رساں اور تباہ کن ثابت ہوتے ہیں اور ہم سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو منشائے الٰہی کے خلاف ہیں۔

جھوٹ بولنے کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایسی شے کی پردہ پوشی کی جائے جسے ہماری عقل حق سمجھتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر انسان حق کو حق نہ سمجھتا ہو تو پردہ پوشی کی ضرورت ہی نہ باقی رہے لیکن حقیقت کو چھپانا اس بات کا ثبوت ہے کہ جان بوجھ کر حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اس لیے نیکی اور راستی انسان کی فطرت ہے۔ جب انسان کی فطرت راستی ہے تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بغیر کسی سبب کے انسان فطری طور پر ہرگز جھوٹ نہ بولے گا۔ اگر جھوٹ بول رہا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس جھوٹ کے ذریعہ بخیال خود یا تو وہ کسی ضرر سے بچنے کا خواہشمند ہے یا کسی نفع کے حاصل کرنے کا متمنی! اور اس کے ساتھ ہی جھوٹ کو وہ خود بھی حق کے خلاف سمجھتا ہے اسی لیے اس کے اظہار کی جرأت نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔

"جھوٹ عاجزی ہے"۔ یہ عاجزی درحقیقت جذبات کے غلط فیصلوں کے سامنے عقل کے صحیح فیصلہ کے سپر انداختہ ہو جانے کی تعبیر ہے۔ بے شک سچ بولنا ایک بڑے اخلاقی جرات رکھنے والے باحوصلہ انسان کا کام ہے۔ جو شخص کسی نقطہ پر بھی لالچ میں مبتلا نہ ہو اور دنیا کی تمام منفعتوں کو ٹھکرا دے لیکن حق کا دامن نہ چھوڑے، جو مصائب و آلام کے ہر ممکن الوقوع طوفان کے سامنے پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہ سکتا ہو وہی اس قابل ہو سکتا ہے کہ اُسے حق پسند اور راست گو کہا جا سکے۔

لفظوں کا مفہوم دماغوں کی پستی و بلندی کے اعتبار سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے اعلیٰ درجہ کے مفہوم کو بیان کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے جو عوام کی سطح فکری سے بالاتر ہو۔ ایسے موقع پر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ لفظوں کا ترجمہ کیا جائے اور اُن کا مفہوم معیّن کیا جائے میں نے ابھی لکھا کہ "جو شخص کسی نقطہ پر بھی لالچ میں مبتلا نہ ہو اور دنیا کی تمام منفعتوں کو ٹھکرا دے لیکن حق کا دامن نہ چھوڑے، جو شخص 'مصائب و آلام' کے ہر ممکن الوقوع طوفان کے سامنے پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہ سکتا ہو وہی اس قابل ہو سکتا ہے کہ اُسے حق پسند اور راست گو کہا جا سکے"۔ اس جملہ میں "منفعتوں" اور "مصائب و آلام" کی لفظوں کا مفہوم عوام کی سطح دماغی کے اعتبار سے ہے۔ اگر اس مفہوم کو ان لفظوں سے تعبیر نہ کیا جائے تو سمجھانے کی کوئی صورت نہیں ہے لیکن یہ حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے یعنی دنیا و دولت و حشم اور شوکت و خدم کا حاصل کرنا جب کہ اس کی وجہ سے حق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا ہو منفعت نہیں ہے بلکہ اپنے نفس کو سچائی کے زیور سے مزین کرنا اور جھوٹ کی آلودگی سے محفوظ رکھنا حقیقی منفعت ہے۔ اسی طرح دوستوں کی مفارقت، کڑیل جوان بیٹے کا داغ، وفادار بھائی کی جدائی، ششماہے بچہ کا نشانہ تیر جفا ہو جانا، تین دن کی پیاس میں ریگِ گرم پر کند چھری سے ذبح ہونا، لاش کی پامالی، سر کا نیزہ پر بلند ہونا، مال و اسباب کا لٹنا، عورتوں کی اسیری مصیبت نہیں ہے بلکہ حق سے منحرف ہو جانا، سچائی کے دامن کو چھوڑ دینا، فاسق کی بیعت کر لینا اور اللہ کی اطاعت سے پھر جانا مصیبت ہے۔

اتنی تشریح کے بعد اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے نفس کی خواہشوں کے غلط تقاضو کے ماتحت کسب منفعت یا دفع ضرر کی غرض سے جھوٹ بول کر حقوق الناس کو پامال کرنا اور سچائی کا دامن چھوڑ دینا ایک مستقل کردار کی تعمیر کرتا ہے جسے ارباب دانش انسان کے نظام اجتماعی کے لیے ہلاک سمجھتے ہیں اور "سچائی" "حق پرستی" اور "راست بازی" ایک وسیع مفہوم کی تعبیر ہے جس کو اختیار کرنا مقاصد الٰہیہ کو پورا کرنے کے مرادف ہے اس لیے کہ فرد کا تحفظ بھی نوع کے حقوق کے تحفظ

ہی پر منحصر ہے سچائی کی یہی وہ اہمیت تھی جسے ہیں نے امام حسینؑ کے قول کا پہلا ضروری جزو قرار دیا تھا اور جس کے سمجھنے پر دوسرے جزو کے سمجھنے کا دارو مدار تھا۔

اس محل پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کے اس اہم اور معرکہ آرا پہلو پر بھی روشنی ڈال دی جائے جسے تقیہ کہتے ہیں اور جسے بعض لوگ جھوٹ کے حدود میں داخل سمجھ لیتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ مقاصد الٰہیہ کے تحفظ کیلیے حقیقت کا اظہار نہ کرنے پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ جھوٹ ہے لیکن یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ جھوٹ بولنے والا حق کو حق سمجھتے ہوئے اپنے ذاتی مفاد کے لیے جذبات و خواہشات کی بیجا پیروی کرتے ہوئے حق کو چھپاتا ہے اور اپنے جھوٹ سے مفادِ نوع کو نقصان پہنچا کر کسب منفعت کی کوشش کرتا ہے اور یہ ناجائز ہے اس لیے کہ اس طرح نوع کو نقصان پہنچا ہو یا بالواسطہ انسان اپنے نفس کو نقصان پہنچا دیتا ہے اور چونکہ عقل کا فرض انسان کو مضرتوں سے بچاتا ہے اس لیے یہ فعل عقلی حیثیت سے مذموم قرار پاتا ہے لیکن جب ظالموں سے سابقہ ہو اور زندگی خطرہ میں ہو اس وقت مقاصدِ الٰہیہ کا تحفظ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظالموں کو ہر ممکن طریقہ سے ظلم سے باز رکھا جائے تاکہ نظامِ اجتماعی میں خلل نہ واقع ہو اور چونکہ ذاتی مفاد کے ساتھ نوع کا مفاد وابستہ ہو جاتا ہے لہٰذا جذبات اور عقل کا بقائے حیات کے تحفظ کے لیے ہر اقدام مستحسن ہے اور اخفائے حقیقت موردِ ملامت نہیں بلکہ عقلی حیثیت سے ممدوح ہے۔

اب دوسرے جزو پر نظر ڈالیے یعنی "عزت کا معیار سچائی ہے" اس قول سے کہ "سچائی عزت ہے" حضرت نے لفظوں کے مفہوم کو بلند تر بنانے اور حقیقت سے روشناس کرانے کے لیے سطح ذہنی کو بلند کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ عزت کا معیار مختلف زمانوں اور دنیا کی مختلف قوموں میں مختلف رہا ہے۔ کبھی نسل اور قوم کو، کبھی دولت اور ثروت کو اور کبھی حکومت و اقتدار کو عزت کا معیار سمجھا گیا لیکن یہ معیار نہایت پست ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام نے ہمیشہ انسان کو بلندی کی طرف آنے کی دعوت دی۔ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے اُن لوگوں سے خطاب کر کے جو نسب پر فخر کرتے ہیں فرمایا:۔

فان یکن لھم من اصلھم شرف یفاخرون بہ فالطین والماء
وان اتیت بفخر من ذوی نسب فان نسبتنا جود و علیاء

(ترجمہ) اگر کوئی اپنی اصل سے شرف کا مدعی ہے تو انسان کی اصل پانی اور مٹی ہے

اگر تم کسی صاحب نسب کا فخر پیش کرو تو ہم اُس کے مقابلہ میں بخشش اور بزرگی سے اپنی نسبت کو بیان کریں گے اور فقط شرافت نسبی کو کافی نہ سمجھیں گے۔"

اور بتا دیا کہ بزرگی اور سخاوت عزت ہے۔ اور کبھی کہا:۔

لا فضل الا لاھل العلم انھم علی الھدی لمن استھدی ادلاء

(ترجمہ) "صاحب شرف و فضیلت تو صرف اہلِ علم ہیں۔ یہ لوگ طلبگارانِ ہدایت کو راہِ ہدایت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔"

یہاں بھی اہلِ ثروت و اربابِ اقتدار اور عالی نسب لوگوں کا تذکرہ نہیں کیا۔

اور امام حسینؑ نے فرمایا کہ "سچائی عزت ہے"۔

معلوم ہوا کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کے پیشِ نظر مقصد ایک تھا یعنی انسان کو علم و ادب سخاوت، سچائی اور راست بازی کی تعلیم دینا۔ صحیح علم، صالح عقل اور سچائی سب ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں ہیں اور سب انسان کو حقیقی راحت روحانی مسرت اور جاودانی عظمت سے ہمکنار بنانے کا سبب ہیں اور یہی عزت کا وہ معیار ہے جس کو پیشِ نظر رکھ کر نوعِ انسانی ترقی کی منزل میں گامزن ہو سکتی ہے۔

سچائی عزت ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ذلت صرف حق سے منحرف ہو جانے میں ہے۔ یہ دو باتیں انسان کو راہِ حق سے ہٹا سکتی ہیں ایک غیر حقیقی عزت کی خواہش اور دوسرے غیر حقیقی ذلت کا خوف۔ جب تک انسان کا حوصلہ پست ہے سربلند نفس انسان کو ان دونوں باتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ سچائی عزت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ عالم کی پیش کی ہوئی جھوٹی عزت کو ٹھکرا کر حقیقی عزت یعنی حق پرستی کو اختیار کیا جائے اور اُن ذلتوں کو جو راہِ حق میں پیش آئیں ذلت ہی نہ تصور کیا جائے بلکہ اُنھیں ظالموں کی ذلت سمجھا جائے۔

بے شک اگر واقعہ کربلا نہ ہوا ہوتا تو ہم نہ سمجھ سکتے کہ عزت کیا ہے اور ذلت کیا ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ باطل کا ہر حربہ کمزور ہی کی شکست کو قطع کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور ذلت دینے کی ہر کوشش اہلِ حق کے لیے مایہ عزت بن جاتی ہے تو ہمیں امام حسینؑ کے قول کی صداقت میں کوئی شک و شبہہ باقی نہیں رہتا۔ کربلا میں ذلت دینے کے لیے دشمنوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ امام مظلوم کے جسدِ اطہر سے اشقیا نے لباس اُتار لیا۔ اُنھوں نے تو چاہا تھا کہ ذلت دیں لیکن حق کی عظمت اور صداقت کی عزت کے نقوش اور ابھر آئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ پشتِ امام پر یتیموں اور بیواؤں کے لیے خرما لاد کر لے جانے کے نشانات موجود ہیں۔ یہی ہیں حقیقی عظمت کے وہ درخشاں نشانات جنھیں اہلِ ستم کی بربریت مٹا سکی اور نہ دشمن کے گھوڑوں کی ٹاپیں!

وہ آج بھی درخشاں ہیں اور ہمیشہ درخشاں ہیں گے اور دنیا کو یہ سبق دیتے رہیں گے کہ الصدق عز۔"

(۲) "الکذب عجزٌ جھوٹ عاجزی ہے"

(مقتل یعقوبی)

جھوٹ یہ ہے کہ انسان حق کو حق سمجھتے ہوئے ذاتی مفاد کے پیش نظر مفادِ خلق کو نقصان پہنچائے اور حقیقت کی پردہ پوشی کرے اور چونکہ فرد کا مفاد نوع کے مفاد سے وابستہ ہے اس لیے جھوٹ عقلی طور پر مذموم ہے۔

حضرت کا یہ قول کہ "جھوٹ عاجزی ہے" دو بحث طلب اجزار سے مرکب ہے:۔

(۱) ایک یہ کہ عاجزی کیا شے ہے؟

(۲) جھوٹ عاجزی کیوں ہے؟

عاجزی قدرت کے مقابل کی لفظ ہے جس کے مفہوم میں کسی امر پر قادر نہ ہونا مضمر ہے۔ فطرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا امر ہے جس پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے عاجزی کی لفظ کو صرف کیا گیا۔ اپنے افعال میں عاجز ہونے کی عقلی حیثیت سے تین صورتیں ممکن ہیں:۔

۱۔ انسان اپنے کسی فعل پر قادر نہ ہو یعنی نیکی اور بدی کا صدور اُس سے قہری طور پر ہوتا ہو۔

۲۔ نیکی پر قادر نہ ہو یعنی فطرۃً بدسرشت ہو۔

۳۔ بدی پر قادر نہ ہو یعنی طبعی طور پر نیک ہو۔

جبر و اختیار کا مسئلہ ہمیشہ سے محلِ فکر و نظر بنا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں مختلف فرقوں کے مختلف خیالات ہیں بعض جبر کے قائل ہیں یعنی انسان کو مجبور سمجھتے ہیں بعض انسان کو بالذات نیک اور بعض فطرۃً شریر تصور کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ قولِ امام کی تشریح کی جائے مسئلۂ جبر و اختیار کو عقلی حیثیت سے سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ اُس کی روشنی میں معصوم کے قول کا مقصودِ اصلی نظر آسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان نہ مطلق طور پر مختار ہے نہ مطلق طور پر مجبور۔ قدرت کے بعض قوانین کے سامنے وہ بے بس ہے اور اُن کی پیروی پر مجبور ہے لیکن اُنھی قوانین کے ماتحت وہ مختار بھی ہے لہٰذا اُس میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

فطرت نے تین قوتیں ہر انسان پر مسلط کر دی ہیں جن کی اطاعت کرنے پر وہ قطعی طور پر مجبور ہے:۔۔۔۔

(۱) قوتِ دافعہ۔ جس کی وجہ سے وہ ہر خطرہ سے بچنے کی کوشش کرنے پر مجبور ہے۔

(۲) قوتِ جاذبہ۔ جس سے وہ بقائے حیات کے لیے کسبِ منفعت کی سعی کرنے پر مجبور ہے۔

(۳) قوتِ امتیاز۔ کسبِ منفعت یا دفعِ ضرر کے لیے وہ مجبور ہے کہ منفعت اور ضرر میں امتیاز کرنے کے لیے عقل کے فیصلہ کے سامنے سرِ اطاعت خم کرے۔

قوتِ دافعہ اور قوتِ جاذبہ کے فیصلے جذبات کے فیصلے ہیں جن پر عقل نظرِ ثانی کرتی ہے لیکن چونکہ عقل کے پاس خود حق و باطل میں تمیز کرنے کی کوئی کسوٹی نہیں ہے لہٰذا وہ استنباطِ نتائج میں تمام اعضائے جسمانی ہی سے کام لیتی ہے اور انھی کے فیصلہ پر آخری فیصلہ صادر کرتی ہے جسے ارادہ کہتے ہیں اس طرح نتیجۃً عقل کو جذبات ہی کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔

جذبات کی پیروی ہمیشہ مہلک اور ضرر رساں نہیں ہوتی بلکہ حکیمانہ حدود میں بقائے حیات کے لیے اُس کی پیروی فطری طور پر لازمی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جذبات کی پیروی کب معینِ حیات ہے اور کب قاطعِ حیات۔ اس کا حل یہ ہے کہ جب مفادِ نوع کے ساتھ ذاتی مفاد کا تصادم ہو اُس وقت جذبات کی پیروی مضر ہے اس لیے کہ انفرادی طور پر افراد کا نوع کو نقصان پہنچانا نتیجۃً ہر فرد کے نقصانات کا باعث ہے اور جب تصادم نہ ہو تو جذبات کی پیروی واجب ہے اس لیے کہ جذبات کی خلقت ہی تحفظِ نفس کے لیے کی گئی ہے۔ دونوں صورتوں میں مقاصدِ الٰہیہ کا تحفظ ہوتا ہے یعنی انسان ضرر سے محفوظ رہتا ہے اور منفعت حاصل کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جذبات کی صحیح پیروی کی کسوٹی عقل نہیں ہے بلکہ علم ہے یا یوں کہا جائے کہ بغیر علم کے عقلِ صالح نہیں پیدا ہوتی۔ علم قوانینِ قدرت کو مدون کرنے کا نام ہے۔ چونکہ قوانینِ فطرت حکیمِ مطلق کے وضع کیے ہوئے ہیں لہٰذا حقیقی علم کی پیروی مقاصدِ الٰہیہ کی پیروی ہے اور بغیر کسبِ علم کے انسان سے نیکی کا ظہور ناممکن ہے۔

علم کے دو شعبے ہیں ایک کا اپنے نفس سے تعلق ہے اور دوسرے کا فلسفۂ تمدن سے بغیر ان دونوں کو سمجھے ہوئے نفسی مسئلہ کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی لیے ہادیانِ دین نے اپنے نفس کو پہچاننے اور حقوق الناس کی اہمیت کو سمجھنے کی بار بار ترغیب کی ہے۔

جب تک انسان اپنے نفسیات سے ناواقف ہے وہ اپنے جذبات کا محکوم رہتا ہے اور جب نفس کی نیرنگیوں سے واقف ہو جاتا ہے تو جذبات کا حاکم ہو جاتا ہے۔ عقل ہی ایک ایسی قوت ہے کہ جب وہ صحیح علم کی روشنی سے دور رہتی ہے تو انسان کو پستی کے عمیق غاروں میں گرا دیتی ہے یہاں تک کہ اُسے انسان تسلیم کرنے میں بھی تکلف ہونے لگتا ہے اور عقل ہی حقیقی علم کی رہنمائی میں انسان کو رفعت و بلندی کے آسمان تک پہنچا دیتی ہے۔ حقیقتاً یہ ہے کہ انسان سے بدی اس لیے سرزد ہوتی ہے کہ اس کی عقل صحیح علم

سے نا واقفیت کے باعث جذبات کے غلط فیصلوں کو قبول کر لیتی ہے اور اُن کے سامنے سپر انداختہ ہو جاتی ہے۔ انسان بخیال خود اپنے فائدہ ہی کی غرض سے بُرائی کرتا ہے اسی طرح اگر وہ حقیقت سے واقف ہو جائے اور اُسے معلوم ہو جائے کہ نیکی ہی میں فائدہ ہے تو اُسی جلبِ منفعت کے جذبہ کے ماتحت جس طرح بُرائی کرتا تھا اُسی طرح نیکی کو بھی اختیار کرے گا اور بدی سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ نیکی اور بدی، نفع اور نقصان مسرت اور الم ہر ایک کا امتیاز حقیقی علم ہی کے ذریعہ ممکن ہے جو بتاتا ہے کہ نوع کی مسرت فرد کی مسرت اور جماعت کا مفاد شخصی مفاد اور حقوق الناس کی ادائیگی نیکی ہے اور صالح عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔

عقل کے خصوصیات سمجھنے پر جبر و اختیار کے مسئلہ کے سمجھنے کا دارومدار ہے ہر انسان اپنی عقل کی پیروی پر مجبور ہے یہ جبر کا درجہ ہے۔ چونکہ صحیح علم کے ذریعہ عقل کو صحیح نتائج تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے اور اُس کے لیے اپنی غرض خلقت کا پورا کرنا ممکن ہو جاتا ہے یعنی نفس انسانی کا تحفظ کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتی ہے اس لیے انسان کو مختار کہا جاتا ہے۔ یعنی انسان کا مختار ہونا نیکی کی اُن صلاحیتوں کے لحاظ سے ہے جو بغیر حقیقی علم کے پیدا نہیں ہوتیں۔

معلوم ہوا کہ "جھوٹ عاجزی ہے" اس قول سے حضرت کا یہ مقصد نہیں ہے کہ انسان مجبور ہے تاکہ یہ نتیجہ نکالا جائے کہ جبر کا نظریہ درست ہے۔ نہ یہ مقصد ہے کہ انسان نیکی پر قادر نہیں ہے اس لیے بدی کرنے پر مجبور ہے تاکہ فطری طور پر انسان کو شریر سمجھ لیا جائے۔ اب تیسری صورت رہ گئی یعنی انسان فطری طور پر نیک ہے۔ بے شک یہ مسلک حق ہے اور یہی امام کا مقصود ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں قوتِ دافعہ و جاذبہ کے ذریعہ ضرر سے محفوظ رکھنا چاہا ہے اور فلسفہ تمدن یہی ہے کہ انسان حقوق العباد کو ادا کر کے اپنے نفس کو فاسد تمدن کے ضرر سے بچائے تو نیکی کا ہر فرد کے لیے مفید ہونا ثابت ہو گیا اور یہی فطرت کا منشا بھی ہے لہٰذا صالح اعمال فطری ہیں اور بدکرداری غیر فطری ہے۔

لیکن چونکہ فطری طور پر انسان کا نیک ہونا کافی نہیں ہے بلکہ انسان کے لیے حقیقی علم حاصل کرنا مقاصد الٰہیہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے اس لیے جھوٹ کو عاجزی سے تعبیر کرنا اسی علمی اصول کی طرف دلالت کرتا ہے جو فطری صلاحیتوں کے باوجود انسان کے لیے علم و ہدایت، تربیت اور عمدہ ماحول کی ضرورت پر زور دیتا ہے اور جس کی بنیاد پر انبیاء و رسل کی ضرورت اور تعلیم و تدریس کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی انسان کی اُس عاجزی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے جو حقیقی علم سے ناواقفیت اور تعلیمات الٰہیہ سے بُعد کا لازمی نتیجہ ہے۔

یہ عاجزی حقیقۃً عقل کی عاجزی ہے۔ جب عقلِ انسانی ذاتی مفاد کو نوع کے مفاد پر ترجیح دے کر بالواسطہ اپنے نفس کو نقصان پہنچا دیتی ہے تو اپنے اُس مقصد کے حصول سے عاجز رہتی ہے جس کے لیے اللہ نے اُسے خلق کیا ہے یعنی نفس کو ضرر سے بچانا اور اسے فائدہ پہنچانا۔ یہی وہ دُور رس اور نتیجہ خیز مفہوم تھا جسے نفسیاتِ بشری کے عالم حضرت امام حسینؑ نے اس فقرہ میں سمو دیا کہ "جھوٹ عاجزی ہے"۔

(۳) السرّ امانۃ "بھید امانت ہے" (مقتل یعقوبی)

زندگی کے کتنے خوشگوار لمحے تلخ ہو جاتے ہیں؟ مسرتوں کے کتنے دل آویز چراغ گل ہو جاتے ہیں؟ اور سکون و اطمینان کے کتنے شیریں نغمات نوحۂ حسرت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم نے اُن کی قدر نہ کی، اس لیے کہ ہم اُن کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھے تا کہ اُن کی حفاظت کرتے، اس لیے کہ ہم مسرت کے مفہوم سے واقف نہیں ہیں۔

مصیبت وہی ہے جو انسان اپنے اوپر خود نازل کرے، قہر وہی ہے جو ہمارے اٹھائے ہوئے طوفان کا نتیجہ ہو اور غم وہی ہے جسے ہم خود اپنے اوپر طاری ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہماری نگاہیں خیرہ ہو چکی ہیں، ہمارے دماغ مفلوج ہو چکے ہیں، ہماری عقلیں معطل ہو چکی ہیں۔ ہم ریگ زار کے پیچھے نالہ زار کے دھوکے میں دوڑتے ہیں لیکن بادِ سموم کے جھونکے اور گرد و غبار کے طوفان ہمیں ریگ کے گرانبار ٹیلوں میں دفن کر دیتے ہیں اور ہماری عقل ہم پر ماتم کرتی رہ جاتی ہے۔ ہم آلام و مصائب کی طرف عیش و مسرت حاصل کرنے کے لیے بے تحاشا بڑھتے ہیں یہاں تک کہ نتائج کا آہنی پنجہ ہماری گردنوں کو اپنی سخت گرفت میں لے لیتا ہے لیکن مصیبت کے ہر شکنجہ کو ہم آنے والی مسرت کی ابتدائی منزل سمجھ کر اُسے برداشت کرتے ہیں یہاں تک کہ ذلت، تباہی، بربادی اور مصیبت کا ہولناک طوفان ہمیں دنیا سے فنا کر دیتا ہے۔

کاش ہم سمجھتے کہ مسرت کیا ہے! کاش ہم جانتے کہ سکون کیا ہے! کاش ہم معلوم کرتے کہ عیش و عشرت کسے کہتے ہیں۔

دوستو! نیکی مسرت ہے، ہمدردی اور محبت سکون ہے اور عیش و عشرت کا مفہوم سمجھنا عیش و عشرت ہے۔

ہم کتنے موقعوں پر لوگوں کو اپنے تبسم، اپنی خندہ پیشانی یا اپنی زبان کی شیرینی سے مسرت کی دولت سے مالا مال کر سکتے ہیں لیکن ہم ایسا کرنے میں نہ صرف بخل کرتے ہیں بلکہ برعکس رویہ اختیار کرتے ہیں بقول حافظ:

رنج یار اگر تواں بُرد بیک گوشۂ چشم — شرط انصاف نہ باشد کہ مداوا نہ کنی

اس طرح ہم اپنے ہمجنسوں کی زندگی کے ساتھ اپنی زندگی کو بھی تلخ کر لیتے ہیں۔

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں ایثار کی حاجت ہوتی ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ایثار ایک بڑے نفس کا کام ہے لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن میں کسی ایثار کی حاجت نہیں کسی تکلیف کو برداشت کرنے کی ضرورت نہیں، صرف فرض کی اہمیت کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے ایسے موقعوں پر ہمیں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جس کے ہم دوسروں سے متمنی رہتے ہیں۔ جو مسرت ہم دوسروں کو دیتے ہیں وہ پھر ہمارے لیے پلٹ آتی ہے اور جس مسرت سے ہم دوسروں کو محروم کر دیتے ہیں اُس سے ہم بھی محروم رہتے ہیں۔

قانون انسان کو درست کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ زندگی کے وہ چھوٹے چھوٹے مسائل جو قانون کے حدود سے خارج ہیں اور جنھیں معمولی سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے مجموعی طور سے ایک عظیم الشان گرانباری کا سبب بن جاتے ہیں۔

معمولی سی بات یہ ہے کہ کسی کا راز افشا نہیں کرنا چاہیے۔

کسی راز کے چھپانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ راز کے ظاہر ہونے سے اُس انسان کے نفس کی کمزوریاں طشت از بام ہونے کا خطرہ ہوتا ہے جس نے اپنا راز کسی کو بعض اسباب یا بعض محرکات کے باعث بتلا دیا ہے اور اُس کے ظاہر ہونے سے اُس کو کسی نقصان کا اندیشہ ہے۔

(۲) اس راز کے افشا ہونے سے اُسے کسی نفع کے حاصل نہ ہو سکنے کا خطرہ ہے۔

جب یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ ہر انسان کے کردار میں خامی ہے تو اُس خامی کی وجہ سے اُسے نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے اس لیے کہ اس سے اس کی اصلاح نہیں ہوگی یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی بُرائی صرف نرمی، ہمدردی اور حُسن خلق ہی سے دُور کی جاسکتی ہے اس کے علاوہ باقی طریقے زیادہ تر بُرائی میں شدت یا کسی نئی خرابی کے پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ اسی لیے ابوالائمہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے مالک بن اشتر کو ایک خط میں جو اُنھیں مصر کی گورنری کے وقت لکھا تھا خطاب کرتے ہوئے فرمایا "کسی کو سزا دے کر خوش نہ ہو اور کسی کو معاف کر کے پچھتاؤ نہیں" اور ایک مقام پر فرمایا "تم لوگوں کی غلطیوں کو معاف کرو جس طرح تم چاہتے ہو کہ اللہ تمھارے گناہ معاف کر دے"۔

حضرت امام حسینؑ کا یہ قول کہ "بھید امانت ہے" رازداری کی اہمیت پر زور دیتا ہے ظاہر ہے کہ کسی بھید کو چھپانے میں نہ کسی ایثار کی ضرورت ہے نہ کسی مشقت کو برداشت کرنے کی حاجت۔ لیکن زیادہ تر لوگ بھید ظاہر کر دیتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اُنھیں اس کے ظاہر کرنے میں یا تو کچھ قباحت نہیں معلوم ہوتی یا نفس تنا گر گیا ہے

کہ اپنے کسی فائدہ کے نہ ہوتے ہوئے بھی دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں اُسے لطف آنے لگتا ہے۔

امانت کی حفاظت ایک نہایت اہم فریضہ ہے۔ چونکہ امانت کا تعلق حقوق الناس سے ہے اس لیے اس بارے میں نہایت تاکید ہے کہ امانت میں خیانت نہ کرنا چاہیے۔ امام حسینؑ جو نفسیات بشری کے ماہر ہیں بھید کو بھی امانت قرار دیتے ہیں۔ اس قول سے نفس انسانی کی بے شمار کیفیتوں کی طرف ذہن متوجہ ہو جاتا ہے جو حدود اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں اور جن پر قابو حاصل کیے بغیر کامیاب، اجتماعی نظام کی تشکیل ممکن نہیں۔

بھید کی امانت کا یہ صرف ایک رُخ ہے جس پر روشنی ڈالی گئی۔ ایک رُخ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس شخص کا بھید ہے اُس کے نفس کی کوئی کمزوری نہ ہو لیکن راز کے افشا میں اُسے دوسروں سے خطرہ ہو یا یہ کہ جس شخص کو اس بھید کا علم ہے اُسے اُس کے ظاہر کرنے میں کوئی لالچ یا نہ ظاہر کرنے میں کوئی خوف ہو۔ ان دونوں حالتوں میں فرض کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور حق پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ بہرحال اپنے فرض کو ادا کیا جائے۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جب بھید کا ظاہر کرنا ضروری ہو اور وہ صورت یہ ہے کہ ایک فرد کے فائدہ کے لیے مفاد حق یا مفادِ عامہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ایسی صورت میں فرد کے مفاد کو نوع کے فائدہ پر قربان کر دینا چاہیے لیکن یہ صورت امام کے اس قول کے حدود سے خارج ہے۔ امام حسینؑ کا قول صرف اُن حالتوں کے بارے میں ہے جب انسان اپنے کردار کی کمزوری کی بنا پر یا فرض کی اہمیت کو سبک سمجھ کر امانت میں خیانت کرنے کا مرتکب ہوتا ہے لہٰذا ضرورت تھی کہ بھید کو چھپانے کی اہمیت پر زور دیا جائے اور بتایا جائے کہ امانت کی حفاظت فرض ہے اور "بھید امانت ہے"۔

---

(۴) "الجوار قرابۃ" "ہمسائگی قرابت ہے"
(سقتل یعقوبی)

قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے نظام اجتماعی میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ قرابت کے فلسفہ پر روشنی ڈالی جائے۔

قرابت ایک فطری تعلق ہے جس سے کوئی انسان نہ مستغنی ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر اجتماعی زندگی ممکن ہے اس لیے کہ فرد اور نوع کے درمیان کی پہلی کڑی خاندان ہے لیکن یہی قرابت جس کا وجود نوع کی رشتہ بندی کے لیے ضروری ہے افتراق و انتشار کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

میرے نزدیک نسل اور خون کی بنا پر محبت نہیں پیدا ہوتی اس لیے کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کا نفسِ انسانی سے تعلق ہے۔ اگر یہ بات معلوم ہو جائے کہ محبت کیوں پیدا ہوتی ہے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے کہ قرابت داروں سے محبت فطری لوازم میں سے ہے یا نہیں۔

محبّت قوتِ جاذبہ کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ قوتِ جاذبہ کا مقصد نفسِ انسانی کے لیے لوازم وجود کو شناخت کرنا ہے لہٰذا بغیر کسی مفاد یا مفاد کے تصوّر کے محبت کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ البتہ محبّت کے مدارج میں فرق ہو سکتا ہے۔ وہ افراد جن کی عقل جذبات یعنی اعضائے جسمانی کے فیصلوں کو فوراً قبول کر لیتی ہے پست درجہ کی محبت کے حامل ہوتے ہیں جبکہ بلند نظر افراد جن کی نگاہیں علم کی تجلّی سے روشن ہوتی ہیں جذبات کے فیصلوں پر بار بار نظرِ ثانی کرتے ہیں یہاں تک کہ اُن کی عقل صحیح نتائج تک پہنچ جاتی ہے اور وہ دُور رس اور گہرے نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے محبت کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال کسی مفاد کا پیشِ نظر ہونا ضروری ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ محبت کا دارو مدار مواصلت اور ذاتی تعلقات پر ہے ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ اگر بیٹے کو بچپن ہی سے ماں سے جُدا کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائے اُس کے بعد وہ دونوں ملیں تو اُن میں محبت کی کوئی کشش ظاہر نہ ہو گی اسی طرح جب ذاتی مفاد سے تصادم پیدا ہو جاتا ہے تو فوراً رشتے شکست ہو جاتے ہیں۔ اعزا و اقارب کو صرف اُسی وقت ترجیح دی جاتی ہے جب دوسروں کے مفاد کے ساتھ اُن کا مفاد متصادم ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعزا و اقارب سے بھی جو محبت ہوتی ہے وہ اپنے ہی نفس کی محبت کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ تاریخ عالم اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محبت درحقیقت "اپنے نفس کی محبت" ہی کی کرشمہ سازی کا نام ہے۔ خارجی اسباب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

بے شک محبّت ایک فطری جذبہ ہے اس لیے یہ کہنا کہ ذاتی مفاد کے پیشِ نظر محبت کرنا جرم ہے درست نہیں ہے اس لیے کہ "نفس کی محبت" جسے ہم برائیوں کی جڑ سمجھتے ہیں فی نفسہ بُری نہیں ہے بلکہ بقائے حیات کے لیے ضروری ہے البتہ "نفس کی غلط محبت" یعنی اپنے نفس کی محبت میں نادانستہ ایسا اقدام کرنا جس سے بجائے نفع کے اُسے نقصان پہنچ جائے خود اپنے لیے بھی اور نوع کے مفاد کے لیے بھی مضر ہے۔ کوئی نہ کہے کہ "نفس کی محبت" اور "نوع کی محبت" میں تصادم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی خیال کہ نوع کی محبت اپنے نفس کو قربان کر دینے اور تباہ کر دینے کے مرادف ہے انسان کے لیے گمراہ کن ثابت ہو رہا ہے۔ اس غلط فہمی کا سبب وہ تلخ تجربات ہیں جو نیک انسانوں کو مختلف زمانوں میں ہوتے رہے جس میں سب سے عظیم اور دردناک واقعہ خود حضرت امام حسین

سے وابستہ ہے۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ ماحول کی پستی اور بلند نظر انسانوں کی کمی کے باعث نیک اور حق پسند افراد مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر ساٹھ فیصدی انسان بھی فرض شناس ہو جائیں تو کسی فرد کو نیکی کے باعث نقصان نہیں پہنچ سکتا بلکہ محسوس طریقہ پر نیکی کے مادی اور روحانی فوائد ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ اگر انسان سمجھ لے کہ نوع کے مفاد کے ساتھ ذاتی مفاد وابستہ ہے اور بغیر نوع کی محبت کے اپنے نفس کے ساتھ صحیح معنوں میں محبت نہیں کی جا سکتی تو یہی نفس کی محبت جو اس وقت غلط فہمی کی وجہ سے انسانی حقوق کو پامال کر دینے پر آمادہ کر دیتی ہے اُن کے تحفظ کا سبب بن سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اُن تمام مادی اور روحانی مفاد کا سرچشمہ نوع کی محبت کو سمجھ لے جن کے حصول کے لیے وہ ناروا ذرائع اختیار کرتا ہے اور اس طرح نوع کے مفاد کو نقصان پہنچا کر بالواسطہ اپنے آپ کو ضرر پہنچا لیتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ کا زمانہ وہ تھا جب عہدِ جاہلیت کے نقوش پھر سے اُبھر رہے تھے۔ قرابت داروں کے لیے حق سے انحراف، قبیلہ پرستی اور نسب پر فخر و افتخار عوام کا شیوہ تھا۔ جس زمانہ کی ضرب المثل یہ ہو کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم" اُس زمانہ کے لوگوں کی تنگ نظری اور ناحق شناسی ظاہر ہے۔ ایسے ناسازگار ماحول میں امام حسینؑ کا قرابت اور محبت کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے ایک کلیہ کی حیثیت سے پیش کرنا وقت کے تقاضوں کے ماتحت بالکل درست تھا لہٰذا "ہمسائگی قرابت ہے" اس کے یہی معنی سمجھنا چاہیے کہ "ہمسائگی کی بنا پر محبت کرو جس طرح قرابت کی وجہ سے کرتے ہو۔"

کوئی شک نہیں کہ یہ قول کہ "ہمسائگی قرابت ہے" ایک ایسے ہمہ گیر اور بین الاقوامی اُصول کی طرف عقلی دعوت ہے جس کی افادیت لامحدود ہے۔ یہ قول رنگ، نسل، قوم، ملک غرضکہ ہر تفرقہ کو ختم کر کے ذہنِ انسانی کو ایک ایسی بلندی عطا کرتا ہے جس کے بغیر اجتماعی زندگی کا مفاد حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔ پھر جس طرح افراد کی ہمسائگی قرابت ہے اُسی طرح قوموں اور ملکوں کی ہمسائگی بھی قرابت ہے۔ اس طرح وہی قرابت جس کی ابتدا افراد سے ہوتی ہے ساری نوع کو ایک رشتۂ محبت میں پرو دینے کا سبب بن سکتی ہے۔

کاش نوعِ انسانی اس گراں قدر درسِ محبت سے سبق حاصل کرے اور اُس مشترکہ مفاد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جس کا فائدہ ہر ایک کے لیے ہے اور جسے نظر انداز کر دینے میں سب کا نقصان ہے۔

(۵) المعونۃ صداقۃ "دستگیری دوستی ہے"

(مقبل یعقوبی)

محبت فلسفۂ اخلاق کی اصطلاح میں قوت جاذبہ کا نام ہے۔ محبت کا جذبہ خلق
کرنے سے اللہ کا مقصد نفس انسانی کا تحفظ ہے اس لیے اپنے نفس سے محبت مذموم نہیں
ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ انسانوں کو اپنے آپ سے محبت نہیں کرنا آتی ہے۔ ظاہر ہے
کہ ہر انسان جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی محبت کے تقاضہ سے ہی کرتا ہے لیکن زیادہ
تر انجام تباہ کن ہوتا ہے اور وہی محبت عداوت ثابت ہوتی ہے۔ اگر انسان قدرت
کے قانون سے واقف ہو جائے تو اسے معلوم ہوگا کہ کسی شے کی خلقت بے ضرورت یا
بے نتیجہ نہیں ہے اس لیے کیونکر ممکن ہے کہ محبت کا ایسا عظیم جذبہ جس کی کارفرمائی
تمام انسانوں میں نظر آتی ہے عبث ہو۔ اگر نفس کی محبت ہی باعث نفس کو ضرر پہنچ
رہا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم محبت کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکے اور غلط فہمی سے ایسے
افعال کے مرتکب ہوئے جن کے نتائج سے اگر ہم واقف ہوتے تو بتقاضائے الفت نفس
کبھی مرتکب نہ ہوتے۔

یہ مسئلہ نہایت عظیم الشان ہے کہ محبت کے جذبہ سے انسان کس طرح فائدہ اٹھائے
اور کس طرح اس کے ضرر سے بچے۔ میرے نزدیک فلسفۂ تمدن اس مشکل کو حل کر سکتا ہے۔
جب یہ بات طے شدہ اور مسلم الثبوت ہے کہ "انسان کے لیے اجتماعی زندگی بسر کرنا ناگزیر
ہے" تو ہر فرد کے لیے نوع کے مفاد کا تحفظ بالواسطہ اپنی فلاح کے حصول کے لیے
لازمی ہے اور نوع کے مفاد کا تصور ہی ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے ہم حق و باطل،
مضر اور مفید، نیکی اور بدی، حماقت اور دانشمندی اور جہل اور علم میں امتیاز
کر سکتے ہیں۔ مذہبی اصطلاح میں جسے "حق" کہا جاتا ہے اسے اخلاقیات کی زبان
میں "نیکی" کہتے ہیں اور میرا عقیدہ ہے کہ نیکی ہی مفید ہے، نیکی ہی دانشمندی ہے
اور نیکی ہی علم ہے۔ اسی طرح بدی مضر بھی ہے حماقت بھی ہے اور جہل بھی۔
لوگوں سے برائی اس لیے سرزد ہوتی ہے کہ وہ برائی کو برائی سمجھتے ہی نہیں
اور اگر رسمی طور پر اسے برائی کہتے بھی ہیں تو دل سے برا نہیں سمجھتے۔ اسی کا سبب
علم کی کمی ہے۔ اگر انسان بدی کو اپنے لیے مفید نہ تصور کرے تو وہ کبھی اس کے قریب
نہیں جا سکتا۔ یقیناً ہر برا آدمی برائی کو عقلمندی، مفید اور قابل قبول سمجھ کر اختیار
کرتا ہے۔ چونکہ دانشمندی کا یہ معیار بہت بلند ہے کہ عقل کے احکام پر دانشمندی
کا اطلاق اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ نفس کو ضرر سے بچانے میں صحیح مشورہ دے سکے

عقل کا فیصلہ نفس کو ضرر سے اُسی وقت بچا سکتا ہے جب انسان کی نظر قانونِ قدرت پر ہو لہٰذا لوگ اُسے سمجھ نہیں پاتے ہیں اور جذبات کے ہر فیصلہ کو جسے عقل قابلِ قبول سمجھ لیتی ہے دانشمندی سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح خود کامی اور نفس پرستی کے جذبات جن سے نوعی مفاد کو نقصان پہنچ جاتا ہے اُسے اپنے لیے مفید سمجھتے ہیں اور ان کی نظر اتنی دُور رس نہیں ہوتی کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ ماحول کو خراب کرنے کے اثرات ہم تک آنا لازمی ہیں اور جو نقصان ہم دوسروں کو پہنچاتے ہیں وہ شکل بدل کر پھر ہمارے پاس پلٹ آتا ہے اس لیے وہ بدی کو مفید سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ خالص مادّی نقطۂ نظر سے بھی بدی کو مفید اور نیکی کو مضر نہیں ثابت کیا جا سکتا۔

محبت کے بارے میں اتنی توضیح کے بعد اب ہم دوستی کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دوستی بھی محبت ہی کی ایک قسم ہے۔ ماننا پڑے گا کہ ہر شخص جو دنیا میں کسی کا دوست ہے یا دوست ہونے کا دعویدار ہے ضرور کوئی ذاتی منفعت پیشِ نظر رکھتا ہے ورنہ دوستی ممکن ہی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ لوگوں نے مخلص اور وفادار دوست کو عنقا سے تشبیہ دی ہے چنانچہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے بھی بے وفا دوستوں کے بارے میں ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے :-

تغیرت المودة والاخآء ۔ وقل الصدق وانقطع الرجآء

(ترجمہ) "دوستی اور برادرانہ الفت کا زمانہ بدل گیا سچائی کم ہو گئی اور لوگوں سے امید ٹوٹ گئی۔"

واسلمنی الزمان الیٰ صدیقٍ ۔ کثیر الغدر لیس لہ رعآء

(ترجمہ) "مجھے زمانہ نے اُس دوست کے سپرد کیا جو نہایت پیمان شکن ہے اور کچھ رعایت نہیں کرتا۔"

اخلاء اذا استغنیت عنھم ۔ واعداء اذا نزل البلاء

(ترجمہ) "یہ لوگ اُسی وقت تک دوست ہیں جب تک میں اُن کی اعانت سے بے پروا ہوں اور جس وقت کوئی بلا نازل ہو اُس وقت دشمن ہیں۔"

ظاہر ہے کہ ہر انسان کا تمام نوع سے تعلق ہے اس لیے جب تک ہر جذبہ معتدل اور متوازن نہ ہو اُس وقت تک اُس کا مفاد حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اُس کے ضرر سے کوئی محفوظ رہ سکتا ہے اور جب تک نوع کا مفاد پیشِ نظر نہ ہو اُس وقت تک توازن پیدا کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ حقوق و فرائض اور حق و باطل کی تعیین نظامِ اجتماعی کے پیشِ نظر ہی ممکن ہے اور چونکہ اسلام نے خدا پرستی کا درس دے کر احکامِ الٰہی کی پابندی پر زور دیا ہے اور عقلی حیثیت سے اُس کے احکام مفادِ اجتماعی کے لیے مفید ہیں اس لیے تصور اگر ہے محبت کے جذبہ میں بھی اعتدال پیدا ہو سکتا ہے اور یہی حضرت

حضرت امیر المومنین نے صحیح فرمایا ہے :-

وکل مودۃ للہ یصفو - ولا یصفو من الفسق الاخاء

(ترجمہ) "اور جو دوستی خدا کے واسطے ہے پاک ہے اور محبت بدکرداری سے صاف نہیں ہوتی"۔

اللہ کی محبت ہی وہ چیز ہے جو تمام انسانوں کے ساتھ ایک اللہ کی مخلوق ہونے کے رشتہ سے اخوت و محبت کے جذبات پیدا کر سکتی ہے اور صحیح محبت کرنا سکھا سکتی ہے۔ اللہ کی محبت حقیقت میں حق کی محبت، اصول کی محبت، اپنے نفس کی حقیقی محبت نوع کی محبت اور قانونِ قدرت کی محبت ہے۔ رسول خدا نے اس مثل کی کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم" جو تشریح فرمائی وہ قابل غور ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب بھائی مظلوم ہو تو اس کی مدد کرو اور جب ظالم ہو تو اسے ظلم سے روک دو اس لیے کہ یہی اس کی مدد ہے"۔ معلوم ہوا کہ محبت حقیقی معنی میں وہی محبت کہے جانے کی مستحق ہے جو حق پرستی اور اصول کے خلاف نہ ہو۔ اپنے نفس کے ساتھ بھی محبت یہی ہے کہ حق کو اختیار کیا جائے اور دوسروں کے ساتھ بھی محبت یہی ہے کہ حق کے اصولوں کے پیش نظر ان سے برتاؤ کیا جائے۔ اگر بیٹا قاتل ہو تو باپ کا فرض ہے کہ وہ اسے حاکم کے حوالے کردے۔ اس کا یہ فعل اس کے نفس کے لیے بھی عقلی حیثیت سے مفید ہے اور اس کے بیٹے کے لیے بھی اور تمام انسانوں کے لیے بھی اور اس کا یہ فعل رضائے الٰہی کا باعث بھی ہوگا۔

امام حسینؑ کا یہ قول کہ دستگیری دوستی ہے اسی مفہوم کا حامل ہے۔ دوسرے کی اعانت کرنا دوستی ہے دوسرے سے اعانت چاہنا دوستی نہیں ہے۔ دوستی کرنے میں عام طور پر لوگوں کے پیش نظر ذاتی مفاد رہتا ہے اس لیے دوستی کے فوائد کو نظر انداز کر کے صرف اس پہلو پر روشنی ڈالی جس کا تعلق فرض سے ہے اور جس کی ادائیگی میں لوگ تلخی محسوس کرتے ہیں۔ امام حسینؑ حکیم روحانی تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ جس طرح خود غرضی اور خود کامی سے دو دوستوں میں سے ہر ایک کو دوسرے سے نقصان پہنچتا ہے اسی طرح دو دوستوں میں سے ہر ایک کے پیش نظر دوسرے کی اعانت اور دستگیری کرنا ہو تو ظاہر ہے کہ ان دونوں کو اس اصول سے یکساں طور پر فائدہ پہنچے گا اور کوئی گھاٹے میں نہ رہے گا۔

دستگیری کے معنی اعانت کرنے کے ہیں لہٰذا مادی فائدہ پہنچانے کے علاوہ روحانی اعانت بھی دستگیری ہے۔ مالی امداد کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ دنیا میں بہت کم ایسے انسان ہیں جو روپیہ کے معاملہ میں عالی ظرف اور دیانت دار ہوں لیکن وہ شخص سب سے بہتر ہے جو اپنے دوست کی مادی امداد کے علاوہ اس کی ذہنی، عقلی اور اخلاقی

درستی میں اُس کا معین ثابت ہو اور ہر لغزش کے موقع پر دستگیری کر کے اُسے حق پر قائم رکھے۔ یہی وہ اعلیٰ ترین نصب العین ہے جو قولِ معصوم سے معین ہو سکتا ہے۔

(۶) الخلق الحسن عبادۃ "اچھا خلق عبادت ہے"

(مقتل یعقوبی)

وہ عبادت" ایسی اہم چیز ہے جسے انسان کا مقصد خلقت قرار دیتے ہوئے خداوند عالم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا "ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون" اسلام نے عبادت کے دو شعبے قرار دیے ہیں۔ ایک طاعت معبود دوسرے حقوق العباد کی ادائیگی۔ چونکہ اللہ نے حقوق العباد کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ کے حکم کی اطاعت عبادت ہے اس لیے حقوق الناس کا ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ اس طرح عبادت کے مفہوم میں ایک ایسی عظیم الشان وسعت پیدا ہو گئی کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ایک حق پرست انسان کا ہر شغل عبادت قرار پا سکتا ہے۔

بے شک عبادت الٰہی زندگی کا ایک اہم مقصد ہے لیکن جب مشیتِ خالق کی روشنی میں حسنِ خلق کی عبادت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالق کے نزدیک حسنِ خلق کا اختیار کرنا مقدس ترین اور الٰہی ترین عبادت ہے۔

اسی لیے بتایا گیا کہ تمھاری عبادت سے اللہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تمھارے ہی فائدہ کے لیے ہے۔ کبھی کہا گیا کہ اللہ کی ذات بے نیاز ہے۔ اگر ساری دنیا عابد ہو جائے تو اللہ کی ربوبیت میں کچھ اضافہ نہ ہو گا اور اگر تمام عالم منکر ہو جائے تو اُس کے اقتدار میں ذرہ برابر کمی نہ ہو گی۔ کبھی حقوق الناس کی اہمیت پر زور دینے کے لیے بتایا گیا کہ اللہ کے حقوق اگر نہ ادا کیے جائیں تو توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں لیکن وہ گناہ نہیں بخشے جا سکتے جن کی وجہ سے لوگوں کی حق تلفی ہوئی ہو۔ معلوم ہوا کہ عبادت الٰہی اگر انسان کے جذبات میں عقلی توازن اور اُس کے کردار میں بلندی نہ پیدا کر سکے تو اُس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے خود حضرت سرورِ کائنات سے جب سوال کیا گیا کہ آپ کی بعثت کا مقصد کیا ہے تو فرمایا کہ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دینا۔ یہی سبب تھا کہ حکیم مطلق نے آنحضرت کو خلقِ عظیم کی سند عطا فرمائی معلوم ہوا کہ نگاہِ قدرت میں حسنِ خلق سے بڑھ کر آب و تاب اور درخشانی میں کوئی جوہر بے بہا ایسا نہ تھا جسے طرۂ امتیاز بنا کر عطا کیا جاتا۔

حسن خلق کی اہمیت پر فیلسوف اسلام حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا قول بھی نہایت گرانقدر ہے فرماتے ہیں "قیمۃ المرء ما قد کان یحسنہ"۔ "انسان کی قدر و قیمت اُس کی نیکی ہے"۔ انسان کی قیمت وہی ہو سکتی ہے جو اس کا مقصدِ زندگی ہو اور وہ سوا حسن خلق کے کوئی دوسری شے نہیں ہو سکتی۔

حضرت احدیت کا ارشاد ہے کہ "انسان کی خلقت کا مقصد عبادت ہے"۔ حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ "حسنِ خلق انسان کا مقصدِ حیات ہے"۔ اور حضرت امام حسینؑ کا قول ہے کہ "حُسنِ خلق عبادت ہے"۔ سب کی مراد ایک ہی ہے تعبیریں مختلف ہیں۔

حضرت امام حسنؑ کی شخصیت بھی حضرت امام حسینؑ کے پیش رو وں میں نہایت اہم ہے اُن کا کوئی قول پیش کرنے کے بجائے ہم اپنی تائید کے لیے خود انھی کو پیش کر سکتے ہیں یعنی یہ کہ امام حسنؑ کی نگاہ میں حسن خلق اتنی اہم شے تھی کہ انھوں نے اس میں اتنا نمایاں کمال حاصل کیا کہ "خلق حسنؑ" مشہور ہو گیا۔

مذہبی حیثیت سے "حسنِ خلق" کی اہمیت واضح ہو گئی اور اُس کا عبادت ہونا ثابت ہو گیا۔ اب مناسب ہو گا کہ عقلی حیثیت سے بھی اس قول پر نظر ڈالی جائے تاکہ یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ عقلِ صالح اور مذہب کے اعلیٰ اُصولوں میں تضاد ناممکن ہے۔ سقراط جو دین راستی کا ایک بڑا رہنما تھا کہتا ہے:-

(۱) نیکی علم ہے اس لیے اس کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ خیر و شر کے اُصول عقلی طور پر لوگوں کو سمجھائے جا سکتے ہیں۔

(۲) کوئی شخص جان بوجھ کر بُرائی نہیں کرتا۔ علم سے ضرور نیکی سرزد ہو گی اور جہل سے بدی۔ بدآدمی بھی شر کو خیر سمجھ کر کرتا ہے۔ فطرۃً وہ بھی خیر کا طالب ہے مگر جہالت کی وجہ سے راستہ بھول گیا ہے۔

(۳) انسان کی فطرت کا کوئی پہلو فنا کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ ہر جبلت کا ایک وظیفہ ہے اور عدل کے ساتھ اس وظیفہ کو پورا کرنے کا نام نیکی ہے۔

"انسان کی فطرت نیکی ہے" اور "اچھا خلق عبادت ہے" ان دونوں اقوال میں کوئی فرق نہیں ہے۔

فطرت کا قانون یقیناً اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے۔ اگر کوئی شخص فطری اُصولوں کا پابند ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مقاصدِ الٰہیہ کا تحفظ کر رہا ہے۔ فطرت کے قوانین سے واقفیت کا نام علم ہے اور یہی علم وہ ہے جسے مذہبی اصطلاح میں معرفت کہتے ہیں جب تک انسان قدرت کے قانون کی عظمت کو نہیں سمجھے گا آخر وقت تک اُس قانون کے بنانے والے کی حکمت و قدرت کا کیونکر تصور کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بغیر علم

حاصل کیے بغیر معرفتِ الٰہی ممکن نہیں ہے۔ نیکی فلاسفہ کی اصطلاح ہے اور عبادت اہلِ مذہب کی لیکن حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ نیکی عبادت کا جزو ہے اور عبادت کو کلی مفہوم حاصل ہے لیکن اس محل پر دونوں کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ یعنی عبادت کو نیکی اور نیکی کو عبادت کہہ سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ :۔

(۱) علم قانونِ قدرت کے اُصولوں سے واقفیت حاصل کرنے کا نام ہے۔
(۲) چونکہ فطرت کا قانون اللہ کا بنایا ہوا ہے اس لیے علم معرفتِ الٰہی کا سبب ہے۔
(۳) علم انسان کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے اس لیے کہ علم ہی وہ شے ہے جو بتا سکتا ہے کہ انسان کی فطرت نیکی ہے اور یہی مذہب کا بھی اُصول ہے کہ "ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔"
(۴) جہل بدی کی طرف لے جانے والی شے ہے اس لیے کہ وہ غیر فطری ہے اور معرفتِ الٰہی کے حاصل ہونے میں مانع ہے۔
(۵) حسنِ خلق یا نیکی عقلی حیثیت سے انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اُس کا مقصدِ حیات ہے اور مذہبی حیثیت سے عبادت! اور اُن میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

ایک پیچیدگی اور اُس کا حل

سقراط کے اس قول کے درست ہونے میں کوئی شبہہ نہیں کہ "انسان کی فطرت کا کوئی پہلو فنا کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ ہر جبلت کا ایک وظیفہ ہے اور عدل کے ساتھ اُس وظیفہ کو پورا کرنے کا نام نیکی ہے۔" لیکن یہ قول نامکمل ہے یعنی محض اس قول سے نیکی کے مفہوم کی تعیین ممکن نہیں ہے یہ تمام سوالات کہ ہر جبلت کا فطری وظیفہ کیا ہے؟ عدل کی تعریف کیا ہے؟ اور نیکی کیا شے ہے؟ تشنۂ مفہوم رہ جاتے ہیں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے کسی قول کی تشریح کلام الٰہی یا حدیثِ رسول یا تفسیرِ ائمہ اور عقل سے کی جاتی ہے۔

اس دقت کو حل کرنے کے لیے ہم اپنی تصنیف "فلسفۂ تمدن" سے دو اقتباسات پیش کرتے ہیں جس کی تصنیف کا مقصد ہی یہ ہے کہ عقلی حیثیت سے نیکی کو انسان کی فطرت اور بدی کو غیر فطری ثابت کیا جائے۔

(۱) فطرت کے تین اہم قوانین

قبل اس کے کہ ہم اپنے دعوے کی توضیح کریں ضروری ہے کہ اُن اُصولوں کی تشریح کر دی جائے جن کا قہری طور پر فطرۃً ہر شخص پابند ہے اور جسے کوئی شخص شکست نہیں کر سکتا۔ ان اُصولوں سے دنیا بہت زمانہ سے روشناس ہے لیکن وہ اُن کی ہمہ گیری سے ابھی تک

ناواقف ہے۔

انسان میں فطرت نے تین قوتیں ودیعت کی ہیں جن پر بقائے حیات کے تحفظ کا دارومدار ہے۔ زندگی کی بقا، کا تحفظ دو باتوں پر منحصر ہے ایک تو یہ کہ اُسے ضرر سے بچایا جائے دوسرے یہ کہ لوازم وجود فراہم کیے جائیں۔ انسان ایک ذی حیات مخلوق ہے۔ اگر فطرت اُس کو یہ قوتیں نہ عطا کرتی تو نہ اُسے خطرہ کی اطلاع ملتی اور نہ مفید اشیاء کا امتیاز ہوتا اور زندگی ایک لمحہ کے لیے بھی محال ہو جاتی۔ وہ تین قوتیں یہ ہیں:۔

(۱) قوتِ جاذبہ۔ جس کا کام یہ ہے کہ وہ تمام مفید اور حیات بخش اشیاء کا ادراک کرے۔

(۲) قوتِ دافعہ۔ جو تمام مہلک اور ضرر رساں چیزوں کو محسوس کرے۔

(۳) قوت عقل جسے ہم قوتِ امتیاز سے تعبیر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں اس لیے کہ اس کا کام محض یہ ہے کہ وہ قوتِ جاذبہ اور قوتِ دافعہ کے محسوسات پر نظر ثانی کرے انسان میں یہ قوت ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ کوئی نہ کہے کہ جب قوت دافعہ اور قوتِ جاذبہ مفید اور مضر اشیاء میں امتیاز کی صلاحیت رکھتی ہیں تو پھر ایک تیسری قوت کا وجود غیر ضروری ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ یہ دونوں قوتیں کسی ایک حصۂ جسم سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جسم انسانی کے ہر جزو میں موجود ہیں گویا مقصد سب کا ایک ہے لیکن تقسیم کار کے باعث تمام اعضاء نے ایک ایک کام اپنے سے مخصوص کر لیا ہے اور زندگی بھر وہ بس یہی کام انجام دیتے رہتے ہیں اور ہر حصۂ جسم کا کام زندگی کے تحفظ کے بنیادی مقصد میں معین ثابت ہوتا ہے۔ آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پیر یہاں تک کہ جسم کا ہر ریشہ ان دونوں قوتوں کا مالک ہے اور اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف ہے۔ تمام احساسات و جذبات و تاثرات انھی قوتوں کا نتیجہ ہیں۔ کسی شے کے متعلق یہ فیصلہ کرنے میں کہ یہ مضر ہے یا مفید سارا جسم مل کر ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے اور اسے قوتِ حافظہ میں بھیج دیتا ہے جسے ہم تمام احساسات و خیالات کا گودام کہہ سکتے ہیں۔

چونکہ جسم انسانی کی قوتیں ہیں محدود اور حقائق ہیں لامحدود اس لیے اس کا برابر امکان رہتا ہے کہ قوتِ دافعہ اور قوتِ جاذبہ کی مدد سے جسم نے جو فیصلہ کسی شے کے مضر یا مفید ہونے کے بارے میں کیا ہے غلط ثابت ہو۔ ہماری نگاہیں برابر دھوکا کھاتی ہیں، ہمارے کان برابر فریب میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ہم ہلاکت کو زندگی اور زندگی کو ہلاکت سمجھ لیتے ہیں اس لیے حکیم فطرت نے ایک تیسری قوت کی موجودگی ضروری سمجھی جو اس فیصلہ پر نظر ثانی کرے اور دوبارہ انھی قوتوں سے کام لے۔ اس طرح یہ قوت حاکم قرار پائی۔

چونکہ قوتِ امتیاز کے پاس کوئی ایسی کسوٹی نہیں ہے جس سے وہ بغیر جسم کو آلۂ کار

بنائے ہوئے اور قوت دافعہ وجاذبہ کی اعانت حاصل کیے ہوئے خود کسی شے کے بارے میں مضر یا مفید ہونے کا فیصلہ کر سکے اس لیے اُسے آخر کار جذبات ہی کے فیصلہ کو قبول کرنا پڑتا ہے اور اُسے حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا۔ اس طرح عقل کبھی جذبات کی حاکم ہو جاتی ہے (یعنی علم کی رہ نمائی میں اپنے مقصد وجود کو پورا کرتی ہے) اور کبھی محکوم اور انسانوں میں دو طرح کے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایک ہی انسان میں دو طرح کے صفات پیدا ہو جاتے ہیں۔

درحقیقت یہی بیان ہماری کتاب کی جان ہے اور اسی پر علم تمدن کا سارا دارومدار ہے۔ ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد تعجب انگیز نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ سب سے اہم نتیجہ یہ ہے کہ ہر انسان تین قوتوں کا مالک ہے اور تقاضائے فطرت یہ ہے کہ ہر ذی روح اپنے تمام اعضائے جسمانی اور ساری قوتوں کے ساتھ اس مقصد کو پیش نظر رکھے کہ اُس کے نفس کو ضرر نہ پہنچنے پائے اور فائدہ حاصل ہو۔ اس طرح تمام انسانوں کا مسلک در طریق کار ایک ہی ثابت ہو گیا۔

۲۔ انسان سے جتنی غلطیاں ہوتی ہیں وہ قوت امتیاز کی کمزوری کے باعث ہوتی ہیں اور چونکہ قوت امتیاز بذات خود کوئی تحقیق نہیں کر سکتی اور اعضائے جسمانی کے مشاہدات و تجربات اور فیصلوں کی پابند ہوتی ہے اس لیے اگر یہ خواہش ہو کہ قوت امتیاز کو تقویت دی جائے تو اپنی تمام قوتوں کو مطالعۂ فطرت میں صرف کرنا چاہیے۔

۳۔ جب معلوم ہو گیا کہ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے تو کسی خطاکار انسان سے نفرت نہیں پیدا ہو گی بلکہ اُس کی ذہنی تربیت کی طرف توجہ مبذول ہو جائے گی۔

ابھی ہمارے دعوے کے ایک جزو کی تشریح باقی ہے وہ یہ کہ پھر وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر قوت امتیاز اپنے فیصلوں کو پرکھ کر کسی شے یا کسی فعل کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے اُسے ہم دوسرے باب میں بیان کریں گے۔

(۲) فلسفۂ تمدن

قوت امتیاز کے فیصلہ کے متعلق یہ طے کرنا کہ وہ حق ہے یا باطل ممکن نہیں ہے جب تک فطرت کے کسی مسلم الثبوت اور ہمہ گیر قانون سے مدد نہ لی جائے جس سے کوئی انکار نہ کر سکے اور جو زمان و مکان کے حدود سے بالاتر ہو۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کے لیے حیات اجتماعی ناگزیر ہے جس کی بنیاد پر حقوق و فرائض اور افراد انسانی کی تحدید حریت کے اصول مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ایسا ہمہ گیر اصول ہے جس سے کسی کو نہ اختلاف ہے اور نہ اسے شکست کرنا کسی کے بس کی بات ہے۔

اب نظام اجتماعی کے وجود کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر فرد کو زیادہ سے زیادہ مسرت،

خوشحالی، لذت، اور آزادی کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے یہی ہے "فلسفۂ تمدن"، یعنی جب ہم اپنی مسرتوں کے حصول اور اپنے لذائذ کے اکتساب میں اجتماعی زندگی کو ضروری سمجھتے ہیں تو اب قوتِ امتیاز کا فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اُن اصولوں کی نگرانی کرے جس پر نظامِ اجتماعی کا دارومدار ہے اور جس سے اُس کا ذاتی مفاد مشروط ہے۔
یہ لوگوں کی قوتِ امتیاز کی غلطی ہے جس کی بنا پر وہ خود غرضی اور خود بینی کو کام میں لاتے ہیں جو ساری برائیوں کی جڑ ہے اور بخیالِ خود اس طریق کار کو اپنے لیے مفید سمجھتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح وہ ساری دنیا کے ساتھ خود غرضی کا برتاؤ کر رہے ہیں اُسی طرح ساری دنیا مل کر اُن کے ساتھ خود غرضی کر رہی ہے اور "نتیجۃً" وہ گھاٹے میں ہیں لہٰذا اگر دوسروں سے فائدہ حاصل کرنا ہے تو انھیں فائدہ پہنچاؤ۔ اسی بنا پر وہی قوتِ واقعہ اور جاذبہ جو انسان کو خود کامی اور جذبات پرستی کا حامی بنا کر نوع میں افتراق و انتشار کا سبب بن گئی ہے اُسے اپنی ذات ہی کے مفاد کے لیے ایک فرض شناس انسان بنا سکتی ہے اور جیسا کہ میں نے دعویٰ کیا ہے کہ الٰہی اصول و قوانین کی بنیاد پر جو فطرت کے وضع کیے ہوئے ہیں اور جنھوں نے نوع کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے اسے اتحاد و یگانگت کے مرکز پر لایا جا سکتا ہے جو فطرت کا منشا رہے اور اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام افعال جو سوسائٹی کو نقصان پہنچا رہے ہیں غیر فطری ہیں اور انھیں ختم ہو جانا چاہیے اس لیے کہ وہ منشائے فطرت کے پورا ہونے میں مانع ہیں۔ اس فلسفہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایثار دانائی ہے محبت مسرت ہے، مفادِ نوع کا تحفظ مفادِ ذات ہے اور اس کے برعکس تمام صورتیں تباہی، ہلاکت اور مصیبت کا باعث ہیں۔
اس نظریہ سے علم النفس اور علم الاخلاق میں ایک زریں اضافہ ہوتا ہے جس پر گراں قدر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ حسنِ خلق جس کا تعلق اس رشتہ سے ہے جو ایک فرد اور نوع میں ہوتا ہے ایک وسیع مفہوم ہے جس کے دائرہ میں پورا انسانی کردار آ جاتا ہے۔ چونکہ عقلی حیثیت سے فطرت کے تینوں اہم قوانین یعنی قوتِ جاذبہ و دافعہ و امتیاز کے مقاصد کو پورا کرنے کا سبب ہے یعنی مقاصدِ الٰہیہ کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے لہٰذا حسنِ خلق عقلی حیثیت سے عبادت ہے۔

(۷) اَلصَّمْتُ زَیْنٌ "خاموشی انسان کی آرائش ہے"

(خاموشی کی تعریف میں جتنے بھی اقوال ملتے ہیں اُن کا مقصد انسان کو ایسی گفتگو سے باز رکھنا ہے جو اخلاقی حیثیت سے مذموم ہو۔ کلام کردار انسانی کا ایک اہم جزو ہے۔ زبان سے فساد کے بڑے بڑے طوفانوں کو روکا بھی جاسکتا ہے اور بڑے بڑے فسادات بھی برپا کیے جاسکتے ہیں۔ یہ دل کے زخموں پر مرہم کا کام بھی کرسکتی ہے اور ایسا زخم بھی پہنچا سکتی ہے جسے کوئی مرہم نہ درست کرسکے۔ یہی زبان کبھی وحی کی ترجمان بن جاتی ہے اور کبھی شیطنت کی ہم آواز۔) وہ بھی زبان ہی تھی جس نے "اقطع کلام الحسین" کی صدا بلند کی جس کی وجہ سے ایسا وحشت ناک حادثہ وقوع میں آگیا جس کی مثال نہیں ملتی اور وہ بھی زبان ہی کی معجزنمائی تھی جس نے شش ماہہ کے گلے پر تیر لگنے کے بعد یہ کہلوایا "هون علی انه بعین الله" (یہ مصیبت میرے لیے آسان ہے اس لیے کہ یہ سب نگاہ قدرت کے سامنے ہو رہا ہے) جو تاریخ عشق الٰہی میں تصور آگہی توت کا بہترین نمونہ بن گیا۔

(غیبت، جھوٹ، بدزبانی، فحش گوئی، اتہام، اشتعال انگیزی اور باطل کی تبلیغ ایسی برائیاں ہیں جن سے خاموشی نفس کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ حکیم اسلام حضرت امیرالمومنین علی ابن طالب اپنے مخصوص فلسفۂ الٰہیات کے ماتحت فرماتے ہیں:-

اَدَّبْتُ نَفْسِی فَمَا وَجَدْتُ لَهَا ۔ بِغَیْرِ تَقْوَی الْاِلٰهِ مِنْ اَدَبٍ

"میں نے نفس کو ادب سکھایا لیکن تقوائے الٰہی سے بہتر کوئی ادب نفس کے لیے مفید نہ پایا۔"

فِی کُلِّ حَالٍ لَا بِهَا وَاِنْ قَصُرَتْ ۔ اَفْضَلُ مِنْ صَمْتِهَا عَنِ الْکَذِبِ

"میں نے نفس کے لیے ہر حالت میں جھوٹ سے پرہیز کرتے ہوئے خاموشی سے بہتر کچھ نہ پایا۔"

وَغِیْبَةُ النَّاسِ اِنَّ غِیْبَتَهُمْ ۔ حَرَّمَهَا ذُوالْجَلَالِ فِی الْکُتُبِ

"غیبت کو خدا نے اپنی کتابوں میں حرام قرار دیا ہے۔"

اِنْ کَانَ مِنْ فِضَّةٍ کَلَامُکَ یَا نَفْسُ اِنَّ السُّکُوْتَ مِنْ ذَهَبٍ

"اگر کلام کو چاندی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو خاموشی کو سونے سے تشبیہ دینا چاہیے۔"

ان اشعار میں خاموشی کی تعریف کرنے سے پہلے اُن برائیوں کا بالاجمال تذکرہ

کر دیا گیا جن کا کلام سے تعلق ہے۔ معلوم ہوا کہ اُن برائیوں سے بچانے کی غرض سے خاموشی کی تعریف کی جا رہی ہے۔ اب ہم اپنے قول کی تائید میں فلاسفۂ یونان کے چند اقوال اپنی مختصر تشریح کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس سے اس بات کی مزید توضیح ہوجائے گی کہ خاموشی اُسی وقت ممدوح ہے۔ جب نفس کو بداخلاقی سے محفوظ رکھنے کا سبب ہو۔

(۱) "جہاں قول کی زیادتی ہوتی ہے وہاں فعل کی کمی ہوتی ہے"۔ —— افلاطون

زیادہ باتیں کرنے سے قوتِ عمل میں سستی پیدا ہو جاتی ہے اس لیے کہ وہ جذبہ جو قوتِ عمل کے لیے درکار ہوتا ہے لفظی جہاد میں صرف ہوجاتا ہے جس کے نتیجہ میں قوتِ عمل کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔

(۲) "خاموشی انسان کے لیے نہایت دشوار امر ہے" —— ارسطاطالیس

ممنوعہ اُمور سے زبان کو باز رکھنے میں نفسِ امارہ کے ساتھ جو جنگ کرنا پڑتی ہے وہ ایک دشوار مرحلہ ہے۔ اس قول میں اسی دشواری کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۳) "شجاعت کا غصہ کے وقت، پارسائی کا شہوت کے وقت اور حکمت کا گفتگو کے وقت پتہ لگتا ہے"۔ —— ارسطاطالیس

اس قول میں بتایا گیا ہے کہ کلام انسان کے علم کا معیار ہے اس لیے اس میں ایک بلند درجہ کے انسان کے لیے بھی جو زبان سے صادر ہونے والے گناہوں کا مرتکب نہ بھی ہوتا ہو ایک بلند تر اور محتاط طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب موجود ہے۔

(۴) "غصہ کی دوا خاموشی ہے" —— سقراط

اس قول میں بھی نفس کو ایک اخلاقی برائی کی مضرت سے بچانے کے لیے خاموشی کو آلۂ کار بنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔

(۵) "سوا کلام کے ہر چیز کی زیادہ پسندیدہ ہے اس لیے اس سے بچو کیونکہ یہ ناپسندیدہ ہے" —— دیوجانس کلبی

اس قول میں گفتگو کی زیادتی کو عیب غالباً اس لیے کہا ہے کہ زیادہ باتیں کرنے سے انسان کی قوتِ فکر کم ہو جاتی ہے۔

(۶) "جس طرح بجانے پر آواز سے مٹی کے درست اور ٹوٹے ہوئے برتن پہچان لیے جاتے ہیں اسی طرح آدمی کی باتوں سے اُس کے کمال اور نقص کو پہچانا جاتا ہے"۔ —— دیوجانس کلبی

یہ قول ارسطو کے اس قول سے مشابہ ہے کہ "حکمت کا گفتگو کے وقت پتہ لگتا ہے" لیکن اس میں اضافہ یہ ہے کہ حکمت کے علاوہ گفتگو کو جہل کے پہچاننے کا بھی ذریعہ بتایا گیا ہے۔

(۷) دیوجانس کلبی نے ایک بہت چُپ رہنے والے نوجوان کی طرف نگاہ کی اور کہا کہ اگر

تمھاری خاموشی کا سبب تمھارا اسو ادب ہے تو تم بڑے با ادب ہو اور اگر حسن ادب ہے تو تم نے اپنے ادب کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا کہ اس کو روک رکھا۔"

اس قول سے صاف صاف توضیح ہو گئی کہ جب خاموشی نفس کو بُرائیوں سے بچانے کے لیے اختیار کی جائے تو ممدوح ہے ورنہ مذموم۔

(۸) "جو حالت جسم کی ہے کہ جب رُوح اُس سے الگ ہو جاتی ہے تو اس کی بدبو باہر پھیلتی ہے یہی حالت جاہل کی ہے جو حکمت سے الگ ہے کہ جو لفظ اس کے منھ سے نکلتی ہے اس کی گندگی اور بدبو سننے والے تک پہنچتی ہے اور جس طرح جسم کو مردہ ہونے کے باعث اسے بدبو کی خبر نہیں ہوتی جو اس سے ظاہر ہوتی ہے اسی طرح جاہل کو اپنے کلام کی بدبو محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ اس کی تمیز بے جان ہوتی ہے"۔ فقدروس

اس قول میں بھی اُن برائیوں کی طرف اشارہ ہے جن کا کلام سے تعلق ہے اور جو جہل کی وجہ سے انسان سے سرزد ہوتی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ "خاموشی انسان کی آرائش ہے" اس قول میں خاموشی کے معنی با محل خاموشی کے ہیں جسے یقیناً انسان کی آرائش کہا جا سکتا ہے۔

---

(۸) الشح فقر "بخل فقیری ہے"
(۹) السخا غنیٰ "سخاوت دولتمندی ہے"

حسین ابن علیؑ
(مقتل یعقوبی)

حضرت کے یہ دونوں قول ایک حقیقت کی دو تعبیریں ہیں لہٰذا اُن کو ایک ساتھ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ایسپ (Aesop) ایک غلام تھا۔ اُس میں تمثیلی حکایتیں بیان کرنے کی بہت اچھی صلاحیت تھی۔ اخلاقی اصولوں کو دلچسپ طور پر بیان کرنے کے لیے اُس نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں جو دلچسپ مختصر اور سبق آموز ہیں۔ یہاں ہم اُس کی ایک حکایت "بخیل" کا ترجمہ درج کرتے ہیں جو انگریزی زبان میں ہے۔ اس حکایت کا ہمارے موضوع سے تعلق ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کی حکایت حکایت ہوتے ہوئے بھی کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔

"بخیل"

ایک بخیل کے پاس روپیہ کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جسے وہ روزانہ گنا کرتا تھا

وہ اپنا روپیہ صرف نہیں کرتا تھا بلکہ اُسے صرف گننے اور دیکھنے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔
بخیل کو اپنے روپیہ کے تلف ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے وہ اسے ایک کھیت میں لے گیا اور ایک گڑھا کھود کر روپیہ کی تھیلی اُس میں رکھ دی اور زمین برابر کر دی۔ ایک شخص نے اُسے روپیہ گاڑتے دیکھ لیا تھا۔ بخیل کے جانے کے بعد اُس نے سب روپیہ نکال لیا اور چلا گیا۔
بخیل کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ سوچتا رہا کہ کہیں کسی کو اُس کا روپیہ نہ مل جائے اور وہ اُسے لے نہ لے۔ دوسرے دن وہ اسے دیکھنے گیا۔ اُس نے کہا کہ میں اسے کسی زیادہ محفوظ مقام پر رکھوں گا جب اُس نے دیکھا کہ کوئی روپیہ لے گیا تو غم سے بے حال ہو گیا اور اپنے تمام دوستوں سے بیان کیا کہ وہ لٹ گیا۔ اُس کے ایک دوست نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ تمھارا زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔ روپیہ تمھارے کسی کام کا نہ تھا تم اس سے کوئی چیز خرید نہ سکتے تھے۔ کیوں نہ تم ایک پتھر لے لو اور اُسے زمین میں ایک گڈھا کھود کر گاڑ دو۔ وہ بھی تمھارے لیے اُتنا ہی مفید ثابت ہوگا جتنا وہ روپیہ مفید تھا۔

اس حکایت سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ چونکہ بخیل اپنی دولت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس لیے "بخل فقیری ہے"۔
سقراط سے کسی نے کہا تم بھی کتنے "محتاج ہو" اس نے کہا کہ اگر تم احتیاج سے واقف ہوتے تو تم کو اپنے ورد سے سقراط کی ہمدردی کی فرصت نہ ملتی (کنایۃً اُس نے یہ کہا کہ گویا کہ میری قناعت ہے جس کو سقراط سمجھا ہے اور احتیاج سے مراد جہالت ہے)
دنیا کے سارے عیب جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے بخل کا سبب بھی لامحالہ جہل ہے۔ علم ہی ایک ایسی دولت ہے جو دولت مندی اور فقیری، نفع اور نقصان اور مسرت و غم کے مفہوم کی تعیین کر سکتا ہے۔ "دولت مند وہ ہے جو علم کی دولت سے مالا مال ہو"۔ "نفع میں وہ ہے جس نے علم حاصل کیا"۔ "مسرت اُسے حاصل ہے جو علم کی سکوں باری سے مستفیض ہے"۔ ارسطو سے پوچھا گیا کہ فاضل کے لیے کس چیز کا جمع کرنا مناسب ہے اُس نے کہا کہ "ایسی چیز کا کہ اگر وہ شخص دریا میں ہو اور کشتی ڈوب جائے تو اُس کی جان کے ساتھ وہ بھی بچ جائے"۔
ناعاقبت اندیشی، حرص اور جہل سے بخل پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان فطرت کے قانون سے واقف ہو جسے علم کہتے ہیں تو یقیناً اُس کا مقصد حیات معین ہو جائے گا اور وہ دولت حاصل کر کے اُسے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں صرف کرے گا اور اُس کا بہترین فائدہ حاصل کرے گا۔ بخیل پہلے روپیہ جمع کرنے میں مصائب برداشت کرتا ہے پھر اس کی حفاظت کرنے میں اور مرتے وقت اُسے چھوڑ کر جانے کی حسرت میں مبتلا رہتا ہے

اس سے بڑھکر اور کیا حماقت ہوگی۔
چونکہ انسان کی نظر میں دولت کا فائدہ ہے اس لیے اُسے اس کی قیمت کا اندازہ ہے اور چونکہ اخلاقی قدروں کا فائدہ بغیر علم کے معلوم نہیں ہو سکتا اس لیے جاہل انسان کبھی اُس کی قدر نہیں کر سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اُدی دولت سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہیں اور دولت کا فائدہ بھی بغیر اُن کے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اُلٹا نقصان ہوتا ہے۔ سونے اور چاندی میں بذات خود کوئی منفعت نہیں ہے نہ کوئی عظمت۔ بقول افلاطون کہ سونے اور چاندی میں اگر کوئی بزرگی ہوتی تو ان سے تانبا ہرگز نہ خریدا جاتا۔
انسان اشرف المخلوقات ہے جمادات کو اپنی ذات پر ترجیح دینا یقیناً اس سبب سے ہے کہ اُسے اپنی معرفت نہیں ہے۔ لیکن انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا سبب اُس کی عقل ہے۔ عقل ہی وہ طرہ امتیاز ہے جو اُسے دوسری مخلوق سے ممتاز بناتی ہے۔
"(۱) عقل کا کام یہ ہے کہ وہ قوت جاذبہ اور قوت دافعہ کے احکام پر نظر ثانی کرے اور انسان کو حقیقی مضرتوں سے بچائے اور حقیقی منفعتوں سے روشناس کرائے۔
(۲) انسان اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے"۔ (فلسفۂ تمدن)
پہلے اصول کے ماتحت بخل غیر عقلی صفت ہے اس لیے کہ اس سے نفس کو ضرر پہنچتا ہے اور عقل کے کسی فعل سے نفس کو ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ جو شخص اس اصول سے واقف ہوگا وہ کبھی حقوق النفس کے ادا کرنے میں بخل کے باعث کوتاہی نہ کرے گا اور وہ یہ سمجھنے کے قابل ہو جائے گا کہ "بخل فقیری ہے"۔
لیکن اس اصول کے جان لینے سے اپنی ذات کو براہِ راست فائدہ پہنچانے کے علاوہ بالواسطہ فائدہ پہنچانے کا تصور نہیں پیدا ہوگا جس کے نتیجہ میں بخل کی جگہ (ڈکٹیٹر شپ) آمریت اور سرمایہ داری لے لے گی۔
لیکن دوسرا اصول کہ "انسان اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے"۔ اُسے بتا دے گا کہ تمام لوازم وجوہ براہ راست حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اس اصول کی بنیاد پر ایثار، محبت اور سخاوت کے جذبات پیدا ہوں گے اب وہ اس قول کے معنی سمجھ سکتا ہے کہ "سخاوت دولت مندی ہے" یعنی نوع کی بہبود میں اپنی منفعت مضمر ہے اس لیے دوسروں کو فائدہ پہنچانا جلب منفعت ہے۔ اگر نوعِ انسانی اس معیارِ عقلی کی سطح پر آجائے تو یقیناً "سرمایہ داری" کے مصائب سے دنیا نجات پا سکتی ہے۔ اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جب تک مرض کی صحیح تشخیص اور اُس کا صحیح علاج نہ کیا جائے گا نظامِ اجتماعی کے جسم میں اسی طرح خود غرضی کا فاسد خون گردش کرتا رہے گا جنگ، بدامنی، قحط اور وباؤں کے پھوڑے پکتے اور پھوٹتے رہیں گے اور تمام خلقت اسی طرح کرب و بے چینی کے عالم میں چیختی اور چلاتی رہے گی۔

حضرات مجتہدین و علمائے و افاضل و اہل الرائے و مخلصین کی اپیل

واقعۂ کربلا نے نوعِ انسانی کے روحانی و ذہنی ارتقا کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے اور جو کام رہتی دنیا تک اولادِ آدم کو اس سے لینا ہے وہ نا محدود ہے۔ تاریخ، نظامِ تمدن، سیاسیات، اخلاق سب پر کربلا کے گہرے اثرات ہیں۔ ذاتِ الٰہی کا یقین، شعائر اللہ کا احترام، فرض شناسی، ایثار و قربانی، مواسات و مساوات، استقلال، جذبۂ آزادی، اجتماعی تنظیم، جوشِ عمل اس مبارک درخت کے پھل ہیں جسے شہادتِ حسینؑ نے اپنے مقدس خون سے سینچا۔ ہر دور کے انسانوں میں مخلصین نے اس کی یاد اور اشاعت سے اپنے عہد کو درخشاں کیا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے شایانِ شان پروگرام بنائیں اور اس پر عمل کریں۔ معیاری لٹریچر، بلند خطابت، اعلیٰ مقصد، بہترین طریقِ کار کے لئے ترقی یافتہ دلوں کی خواہشیں بڑھتی جا رہی ہیں۔

ہمارے ملک کے مشہور صاحب قلم علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کاموں پوری مجتہد العصر نے عراق و شام کے سفر میں وہاں کے اہلِ علم اور کتب خانوں سے فائدہ اٹھایا اور مصر میں تو خاص طور سے فنِ تاریخ کے مطالعہ میں عرصۂ دراز صرف کیا۔ موصوف نے واقعۂ کربلا کے مصادر کی اشاعت اور ان پر بحث و نظر کی مبارک تحریک کو آگے بڑھانے کی طرف اپنی توجہ مبذول کر رکھی ہے۔ آپ نے عقبہ بن سمعان صحابی امام حسینؑ کا مقتل تیار کیا اور اسے تاریخی ملاحظات کے ساتھ شائع کیا جس کی ہندوستان کے باہر بھی دھوم ہے اور ابن واضح یعقوبی کا مقتل ترجمہ و نقد و نظر کے ساتھ شائع کیا۔ آپ کی تجویز ہے کہ واقعۂ کربلا سے متعلق قدیم ترین اور ہر صدی کے مؤلفات جو مخطوط اور نادر الوجود ہوں یا غیر مرتب ہوں انھیں ترتیب و تدوین و ترجمہ و درایت کی کسوٹی پر کس کر حق و صداقت کو نمایاں کر کے شائع کیا جائے تاکہ معلومات میں اضافہ ہو اور عوام لغزش سے بچیں۔ اور ذہن میں قوتِ پرواز پیدا ہو اور قدم ترقی کے راستے پر لگ جائیں۔ مثلاً مقتل ابو مخنف یحییٰ ۱۵۷ھ، مقتل حمید بن مسلم، مقتل عمار دہنی، مقتل ابو حنیفہ دینوری م ۲۸۲ھ۔ مقتل ابن قتیبہ دینوری م ۲۱۳ھ مقتل ابو الفرج اصبہانی م ۳۵۶ھ۔ مقتل ابن جریر طبری م ۳۱۰ھ۔ مقتل شیخ مفید م ۴۱۳ھ۔ مقتل مسعودی م ۳۴۶ھ مقتل ابن شہر آشوب مازندرانی م ۵۸۸ھ۔ مقتل ابن عساکر م ۵۷۱ھ۔ مقتل ابو الفرج ابن جوزی م ۶۵۴ھ۔ مقتل ابن طلحہ شافعی م ۶۵۲ھ۔ مقتل ابو الحدید معتزلی م ۶۵۵ھ۔ مقتل ابن کثیر دمشقی م ۷۷۴ھ

مقتل ابن اثیر جزری م ۶۳۰ھ مقتل ابن طقطقی م ۷۰۹ھ مقتل ابو الفدا م ۷۳۲ھ
مقتل ابن صباغ مالکی ۸۵۵ھ مقتل جلال الدین سیوطی شافعی م ۹۱۱ھ مقتل ابن
حجر ہیثمی شافعی م ۹۷۴ھ مقتل خمیس دیار بکری م ۹۹۶ھ۔ مقتل قرمانی م ۱۰۱۹ھ
مقتل علامہ مجلسی م ۱۱۱۱ھ مقتل محمد صبان مصری وغیرہ کو ان کی اصل عبارات
کو جائزہ تاریخی و ترجمہ و تشریحات کے ساتھ شایع کیا جائے۔

ضرورت ہے کہ قوم کا ہر طبقہ حسب حیثیت و صلاحیت اس تجویز کا خیر مقدم کرے۔
اس کی نشر و اشاعت کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے تنہا علامہ کاموں پوری مذکورہ بالا
کتابوں کو نیز دیگر مخطوطات و نوادر کو فرصت قریب میں پریس میں نہیں لا سکتے لہذا اپنے
اپنے حلقہ میں اس پر کام کیا جا سکتا ہے۔ اس سے واعظین و ذاکرین و مورخین و ادبا اور
اونچے درجہ کے مصادر سے اپنے خیالات مرتب کریں گے اور حق کے جویا اس کی روشنی
میں راہ نجات پائیں گے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، شیعہ، غیر مسلم عیسائی، ہندو
وغیرہ صدیوں سے اس واقعہ کو جس عظمت و احترام سے دیکھ رہے ہیں اسے دنیا کے سامنے
دکھا جائے اور آیندہ نسل کے سامنے اس واقعہ کو بطور ایک مقدس اور لافانی میراث کے
چھوڑا جائے۔

ممتاز العلماء مولانا سید محمد (میرن) صاحب مجتہد العصر امام مسجد شاہی حسین آباد لکھنؤ۔
(مولانا) ریاض الحسن (صدر الافاضل)۔ اطہر حسین جعفری (ملا فاضل۔ ایم۔ اے) مولانا
سید مبارک حسین صدر الافاضل۔ مولانا محمد علی فاضل فقہ الہ آباد۔ مولانا یاور مہدی فاضل
ادب و دبیر کامل لکھنؤ یونیورسٹی۔ مولانا وزیر علی فاضل ادب و فاضل تفسیر۔ خاں بہادر
علی سجاد حسین پنشنر کلکٹر و مجسٹریٹ۔ ایم۔ بی۔ ای۔ شیخ ممتاز حسین جون پوری سابق صدر
انجمن وظیفہ سادات و جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس۔ احتشام حسین ایم اے
لکچرار اردو لکھنؤ یونیورسٹی۔ یوسف حسین موسوی ایم۔ اے لکچرر فارسی و اردو لکھنؤ
یونیورسٹی۔ کیپٹن آغا حیدر ایم اے سابق ریڈر شعبہ فارسی ناگپور یونیورسٹی۔
منجب حسین بی اے ایل ایل بی وکیل کانپور۔ یوسف حسین رضوی بی اے ایل ایل بی
وکیل لکھنؤ۔ مطلب حسین بی اے ایل ایل بی لکھنؤ۔ نوازش علی خاں ایم ایل اے۔
ڈاکٹر سرور حسین امین آباد لکھنؤ۔ مرزا عزیز الحسن صدر انجمن سجادیہ کانپور۔
سید نواب افسر امین آباد۔
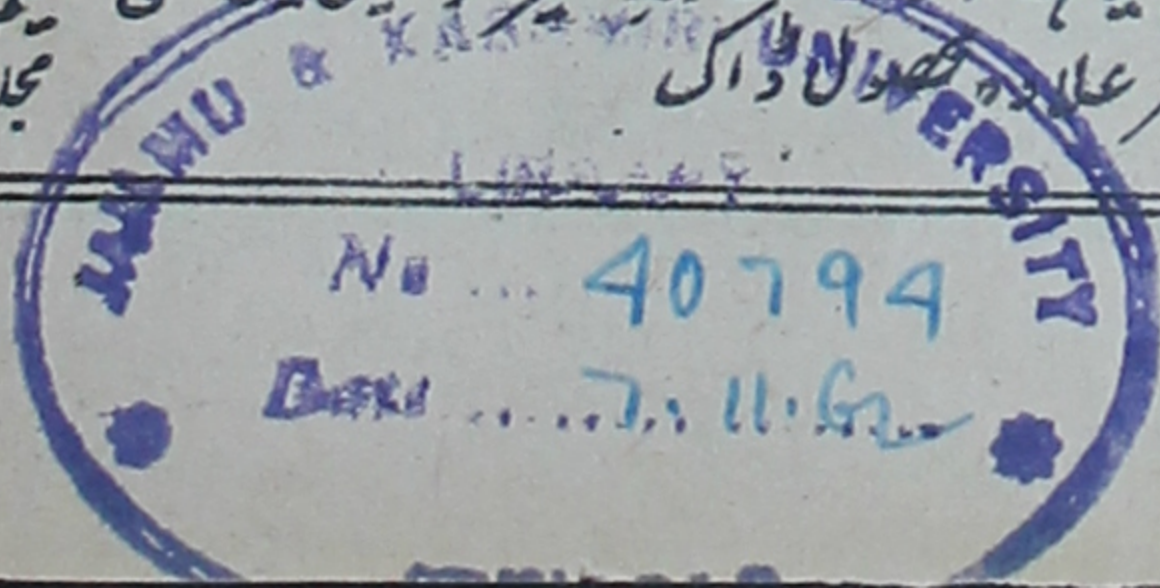
علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب کی تحریک کا خیر مقدم

از مولانا سید محمد (میرن صاحب) مجتہد لکھنؤ

علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری مسلم الثبوت مجتہد ہیں اور قوم کے لیے آپ کی ذات باعث عزت و شرف ہے۔ آپ ۱۳۵۳ھ میں عراق تشریف لے گئے پھر شام کا سفر کیا اور وہاں سے مصر تشریف لے گئے۔ آپ کے پاس عراق و شام و ایران و ہندوستان کے ممتاز علماء کے اجازات اجتہاد ہیں۔ بعض اجازے اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ علامہ علی آل کاشف الغطا نجفی آپ کے کمالات علمی اور قلمی جہاد کے پرزور الفاظ میں معترف ہیں۔ شام کے مشہور روزگار مجتہد امین عاملی اپنے اجازہ میں آپ کو نہایت بلند الفاظ میں یاد فرمایا ہے۔ ان کی عبارت ہے حاصل له ما هو المراد من العلم والفضل والاجتهاد۔ علامہ ابو عبداللہ زنجانی جنھیں ایران میں کافی اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور جو ایک مشہور مصنف بھی ہیں موصوف نے اپنے بلند پایہ اجازۂ اجتہاد میں آپ کے متعلق تحریر فرمایا ہے فهو بفضل الله العزيز بلغ مرتبة الاجتهاد وحرم عليه التقليد فعليه العمل بما يعلم واجتهاده۔ ہمارے خاندان اجتہاد کے مشہور مجتہد شمس العلماء مولانا ابن حسن صاحب مرحوم کا بلند پایہ اجازۂ اجتہاد بھی آپ کے پاس ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے انه ممن وجب عليه الاجتهاد وحرم عليه التقليد۔ علامہ کاموں پوری ہندوستان کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں اور ملک کے باہر بھی آپ کی علمی شہرت پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کے وسیع علم اور پرفیض قلم اور دلپذیر خطابت سے حضرت پروردگار عالم قوم و ملک کو عرصۂ دراز تک مستفید فرمائے آپ نے تاریخ اسلامی کے قدیم ترین مصادر اور واقعۂ کربلا کے قدیم مخطوطات و نوادر اور اہم ترین تصنیفات کی اشاعت کی جو تحریک دنیائے اسلامی کے سامنے اس وقت پیش کی ہے وہ ایک مبارک و مقدس اور ضروری تحریک ہے۔ خدا کرے یہ تحریک کامیاب ہو اور تاریخ اسلام خصوصاً واقعۂ کربلا کے قدیم مصادر پر بحث و تراجم کے سلسلے پریس میں جلد جلد آئیں۔

سہرنامہ کلام محبت حسین (تبصرہ: از ادیب یگانہ حضرت اثر لکھنوی)

ادیب ملت حضرت مشتہد صفی پوری کا یہ نیا مرثیہ صنف مرثیہ گوئی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے جس کی بنیاد تاریخی حقائق اور فلسفۂ شہادت پر ہے۔ حجم ۴۸ صفحات کاغذ چکنا ۲۰ پونڈ سائز ۲۰×۳۰ ٹائیٹل رنگین۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت صرف ۸ر علاوہ محصول ڈاک

(سرفراز قومی پریس نادان محل لکھنؤ)

قیمت: ۔/۴